سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی

تفہیم القرآن

حقیقت کی روشنی میں

افسر نشر و اشاعت

دار الاشاعت کتب اسلامیہ

۱۷ مولانا آزاد روڈ، جیکب سرکل، بمبئی ۴۰۰۰۱۱

نام کتاب :۔ تفہیم القرآن حقیقت کی روشنی میں

مفسّر :۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی

نقد و نظر :۔ راہ نورد

تعداد :۔ دو ہزار ۔ بارِ اوّل

ناشر :۔ دارالاشاعت کتب اسلامیہ

۱۷ مولانا آزاد روڈ جیکب سرکل بمبئی ۱۱ فون، 398330 / 893438

کتابت :۔ مولوی محمد حنیف بستوی

مطبع :۔ ناولٹی پرنٹرس ۴۔ اے :
پی ۔ جی سولنکی مارگ
بمبئی 400007

سنِ اشاعت :۔ دسمبر ۱۹۷۸ء

قیمت :۔ آٹھ روپیہ

ملنے کا پتہ

دارالاشاعت کتب اسلامیہ

۱۷ مولانا آزاد روڈ ۔ جیکب سرکل بمبئی ۴۰۰۰۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم ؕ

پیش لفظ

بانیٔ جماعتِ اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفسیر بعنوان "تفہیم القرآن"، منظر عام پر آچکی ہے جماعتِ اسلامی کے ارکین میں قدرتاً اس کی مقبولیت ہونی چاہیئے تھی۔ اور ہمارے اندازے کے مطابق اس نے غلو کی حدوں کو چھو لیا ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس کے فطری تقاضے جن پر دین و دُنیا کی اساس ہے۔ اس کی بنیاد اسی پر مستحکم ہے۔ اگر ہم اپنی تقاضوں کی بنیاد پر افہام و تفہیم سے کام لیں۔ تو ہم پر جلد کھل جاتا ہے۔ کہ مفسرین کی متفق علیہ تفاسیر کی معنی آفرینی و شوکتِ لفظی کے باعث زیرِ نظر تفسیر کے اہم گوشے اپنی ضعیف تاویلات کے ذریعہ انتہائی مضحکہ خیز ہو گئے ہیں۔ اور جن کا قرآن کے متن سے کوئی ربط نہیں ہے۔ یہ کچھ قلم کی کمزوربیانی اور کچھ استنباط کی ناتوانی کا لازمی نتیجہ ہے۔

دارالاشاعت کتب اسلامیہ بمبئی کو فخر ہے۔ کہ اس نے اہم دینی خدمت میں دلچسپی کے پیشِ نظر اس مواد کو جو ہفت روزہ پیغام صلح لاہور کی جلد ۶۳ شمارہ ۶ تا ۱۷ مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۷۶ء تا ۲۸ اپریل ۱۹۷۶ء بعنوان سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کا ایک مختصر جائزہ شائع ہوتا رہا ہے۔ اور فاضل "راہ نورد"، کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے قارئین کی خدمت میں کتابی شکل میں "سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن حقیقت کی روشنی میں"، شائع کررہا ہے۔

آیئے راہ نورد کی محنت شاقہ پر غور کر کے تفہیم القرآن کے مصنف سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے فہم قرآن کی افادیت پر غور کریں۔ اور حقیقی معنوں سے بہرہ اندوز ہوں۔

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی

تفہیم القرآن حقیقت کی روشنی میں

ہمیں نہ اس بات کا کوئی دعویٰ ہے کہ ہم مفسر قرآن ہیں اور نہ یہ غلط فہمی کہ قرآن حکیم کے مطالب و معانی کو جس طرح ہم سمجھ پائے ہیں وہ بس ہمارا ہی حصہ تھا کسی اور کو وہ سمجھ عطا نہیں ہوئی کہ وہ اس بحر ذخار سے انمول موتی ڈھونڈ نکالے یہ مقام و مرتبہ کہ کلام اللہ کے بعض رموز و نکات کی حکمت خاص طور پر ایک مخصوص معانی میں کھولی جائے صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے یا ان اولیاء اللہ کا ہے جنہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں اللہ جلشانہ کسی مخصوص خدمت کے ادا کرنے کے لئے چن لے ہمیں تو اپنی سمجھ اور علم کے مطابق محض ایک طالب علم ہونے کی سعادت ہی نصیب ہو جائے تو یہ مقام فخر و شکر ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ ہماری زندگی کی راہ کو یہ روشنی جو اس مصفیٰ اور پرسکون قندیل سے نکل رہی ہے روشن رکھ سکے تاکہ راہ کی کٹھنائیاں نظر آئیں اور اگر کہیں ٹھوکر لگے تو سنبھل کر ہم راہ پر پھر چل سکیں۔ ہم نے اس مقصد سے کلام پاک پر لکھی جانے والی تفسیریں اور کتابیں پڑھنے کی کوشش کی اور اسی لئے تفسیر تفہیم القرآن کا بھی مطالعہ کیا۔

جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تقریباً تیس برس ہوئے قرآن پاک کی تفسیر اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن میں قسط وار چھاپنا شروع کی تھی۔ مقصود یہ بھی تھا کہ اگر کسی مقام پر کسی قاری کو کوئی ایسی بات محسوس ہو جس میں مودودی صاحب کو وہ کوئی مشورہ دے سکے تو وہ ضرور دے تاکہ جب کتابی شکل میں یہ تفسیر چھپے تو وہ اشکال رفع کی جا سکیں۔ شاید برس ۱۹۷۲ء میں یہ سالہا سال کی طویل محنت اختتام کو پہنچی

اور جماعت اسلامی نے اس کے لئے خاص طور پر جشن منائے اور اس دن سے مودودی صاحب کو صاحب تفہیم القرآن کہنا شروع کر دیا۔

تفسیر تفہیم القرآن چھ ضخیم جلدوں میں چھپی ہے۔ ہمارے پاس اس کے مختلف برسوں کے مطبوعہ مندرجہ ذیل نسخے ہیں۔

(۱) جلد اول۔ پانچواں ایڈیشن طبع ہفتم اکتوبر ۱۹۶۶ء کاپی نمبر ۱۹۸۷۷۔

(۲) جلد دوم۔ آفسٹ ایڈیشن طبع چہارم ۱۹۶۷ء کاپی نمبر ۴۵۴۴۔

(۳) جلد سوم۔ دوسرا ایڈیشن طبع چہارم فروری ۱۹۷۰ء کاپی نمبر درج نہیں۔

(۴) جلد چہارم ——— طبع چہارم۔ اپریل ۱۹۷۰ء کاپی نمبر ۹۶۰۰۔

(۵) جلد پنجم ——— طبع دوم۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء کاپی نمبر درج نہیں۔

(۶) جلد ششم ——— طبع اول اکتوبر ۱۹۷۲ء کاپی نمبر درج نہیں۔

جلد اول کے مقدمہ میں مودودی صاحب نے لکھا ہے:—

"ناظرین کرام سے میری درخواست ہے کہ صرف اس مقدمے کو دیکھ کر ہی اس کے تشنہ ہونے کا فیصلہ نہ کر دیں بلکہ پوری کتاب کو دیکھنے کے بعد اگر ان کے ذہن میں کچھ سوالات جواب طلب باقی رہ جائیں یا کسی سوال کے جواب کو وہ ناکافی پائیں تو مجھے اس سے مطلع فرمائیں"

قرآن پاک کے تراجم اور تفاسیر اردو میں بھی بے شمار ہو چکے ہیں۔ مودودی صاحب نے اسی لئے اپنے ترجمہ اور تفاسیر کے شروع میں ہی کہہ دیا ہے کہ اس راہ میں مزید کوشش اگر معقول ہو سکتی ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ آدمی کسی ایسی کسر کو پورا کر رہا ہو جو سابق مترجمین و مفسرین کے کام میں رہ گئی ہو یا طالبین قرآن کی کسی ایسی ضرورت کو پورا کرے جو کہ پچھلے تراجم و تفاسیر سے پوری نہ ہوتی ہو۔ ان صفحات میں ترجمانی و تفہیم قرآن کی جو سعی کی گئی ہے وہ دراصل اسی بنیاد پر ہے۔ میں ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگوں میں روح قرآن تک پہنچنے اور اس کتاب پاک کے حقیقی مدعا سے روشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہو گئی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے وہ مترجمین اور مفسرین کی قابل قدر مساعی کے باوجود ہنوز تشنہ ہے۔ (تفہیم القرآن جلد اول صـ۵)

تفسیر تفہیم القرآن لکھنے کا مقصد مودودی صاحب نے بیان کیا۔ اوپر بھی کہا کہ پوری کتاب پڑھنے کے بعد بھی اگر اس باب میں کوئی تشنگی یا ذہن میں کوئی جواب طلب سوال پیدا ہو جو گذشتہ مترجمین اور مفسرین کی سعی کے علی الرغم رہ جانے والے خلا کو پر کرنے کے لئے اس تفسیر کی تدوین کا اصل مقصود ہے تو پڑھنے والا مودودی صاحب کو ضرور اس سے آگاہ کرے۔ مودودی صاحب نے دیباچہ میں اپنے قارئین کی بھی نشاندہی کر دی ہے تاکہ جو توقعات تفسیر مذکورہ سے وابستہ کی جا سکیں۔ ان کی حدود کا بھی تعین ہو جائے:۔

"اس کام میں میرے پیش نظر علماء اور محققین کی ضروریات نہیں ہیں اور نہ ان لوگوں کی ضروریات ہیں جو عربی زبان اور علوم دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد قرآن مجید کا گہرا تحقیقی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے حضرات کی پیاس بجھانے کے لئے بہت کچھ سامان پہلے سے موجود ہے۔ میں جن لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں وہ اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ جو عربی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اور علوم قرآن کے وسیع ذخیرے سے استفادہ کرنا جن کے لئے ممکن نہیں انہی کی ضروریات کو میں نے پیش نظر رکھا ہے" (ایضاً)

پھر تفسیر اور ترجمہ میں جو طریق کار انہوں نے اختیار کیا ہے اس کے بارے میں کہا ہے:۔

"میں نے اس کتاب میں ترجمے کا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے"، (ایضاً)

ایسا طریق کار اختیار کرنے کی انہوں نے طویل وجوہ لکھی ہیں تاکہ کہیں یہ غلط خیال قائم نہ ہو جائے کہ وہ لفظی ترجمے کے طریق کار کو غلط سمجھتے ہیں۔

یوں تفسیر تفہیم القرآن نے اپنی امتیازی خصوصیات کا مختصراً تذکرہ کر دیا ہے۔ یعنی یہ کہ اس کا مخاطب طبقہ:۔

(ا) اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو عربی سے اچھی طرح واقف نہیں۔

(ب) عام تعلیم یافتہ لوگوں میں جو روح قرآن تک پہنچنے کی طلب پیدا ہو گئی ہے وہ مترجمین اور مفسرین کی قابل قدر مساعی کے باوجود ہنوز تشنہ ہے۔

(ج) یہ کوشش (یعنی تفسیر تفہیم القرآن) اگر معقول ہو سکتی ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ یہ کسی ایسی کسر کو پورا کر رہی ہو جو سابق مترجمین کے کام میں رہ گئی ہو۔

تفسیر مذکور کے شروع میں آٹھ صفحات کا دیباچہ اور اٹھائیس صفحات کا مقدمہ درج ہے۔ مقدمہ میں مودودی صاحب نے قرآن پاک کے سمجھنے میں جو مشکلات پیش آسکتی ہیں، جو سوالات پیدا ہو سکتے ہیں اور بقول ان کے وہ سوالات بھی جو خود ان کے ذہن میں مطالعہ قرآن میں اول اول پیدا ہوئے تھے یا بعد میں سابقہ پیش آیا ان پر بحث کی ہے۔ اب اس بات کا فیصلہ کہ گذشتہ ترجموں اور تفاسیر میں کونسی کمی تھی جو اس تفسیر نے پوری کر دی ہے۔ انہوں نے قاری پر چھوڑ دیا ہے کیونکہ تشنگی کا حوالہ جو انہوں نے شروع میں دیا تھا اس کی نشاندہی ان کے دیباچے یا مقدمے میں کہیں نہیں ہوتی۔ نہ صرف یہ بلکہ :-

"وہ بہت سے تفسیری مباحث کو میں نے سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگایا جو علم تفسیر میں بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر اس طبقے کے لئے غیر ضروری ہیں۔ پھر جو مقصد میں نے اس کام میں اپنے سامنے رکھا ہے وہ یہ ہے کہ ایک عام ناظر اس کتاب کو پڑھتے ہوئے قرآن کا مفہوم و مدعا بالکل صاف صاف سمجھتا چلا جائے اور اس سے وہی اثر قبول کرے جو قرآن اس پر ڈالنا چاہتا ہے۔ نیز دوران مطالعہ جہاں جہاں اسے الجھنیں پیش آسکتی ہوں وہ صاف کر دی جائیں۔ اور جہاں کچھ سوالات اس کے ذہن میں پیدا ہوں ان کا جواب اسے بر وقت مل جائے۔" (ص ۶)

یعنی تفسیر زیر نظر کا مقصد قرآن پاک کے مفہوم و مدعا کو صاف صاف سمجھانا ہے۔ اسی طرح جس طرح کہ قرآن پاک چاہتا ہے تاکہ قاری پر وہی اثر مرتب ہو جو وہ کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اگر دوران مطالعہ کوئی الجھن پیدا ہو تو وہ صاف ہو جائے۔ اور جو سوال پیدا ہو اس کا جواب مل جائے۔ اگر تفسیر تفہیم القرآن اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئی ہے تو یقیناً یہ اسلامی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔

یہ سمجھنے کے لئے کہ تفسیر تفہیم القرآن اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب رہی ہے۔ ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ جس کتاب کی تفسیر و تشریح کر رہی ہے اس کتاب کا موضوع اور مدعا کیا ہے۔ مودودی صاحب نے خود بھی یہی تنقیحات اپنی تفسیر کے مقدمے میں بھی قائم کی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے خود اس بارے میں جو تعین کیا ہے وہ یہ ہے :-

(۱- اس کتاب کا موضوع انسان ہے اس اعتبار سے کہ بلحاظ حقیقت نفس الامری اس کی فلاح اور اس کا فساد کس چیز میں ہے۔

ب۔ اس کا مرکزی موضوع انسان کی ظاہر بینی۔ قیاس آرائی۔ یا خواہش کی غلامی کے سبب قائم کردہ نظریات کی بنا پر اختیار کردہ رویے کی غلطی کھول کر دکھانا ہے اور اس سے پیدا ہونے والے خطرناک نتائج سے اسے آگاہ کرنا ہے۔

ج۔ اور اس کا مدعا اس صحیح رویہ کی طرف دعوت دینا ہے جسے انسان اپنی غفلت سے گم اور اپنی شرارت سے مسخ کرتا رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآن پاک میں ان مندرجہ بالا تین امور کے بارے میں جو باتیں بھی زیر بحث آئی ہوں گی ان سے مقصد انہی امور کا صاف صاف واضح کرنا انہیں دل میں بٹھانا اور عملی زندگی میں اس راہ کو اختیار کرنے کی بے اختیارانہ تحریص کا پیدا کرنا ہی ہوگا اور جو تفسیر یا تشریح نتیجۃً اپنے منطقی یا عملی اثرات میں اس مقصد سے ہٹا سکتی ہو وہ یقیناً اس کے صحیح مفہوم کی ترجمان نہیں ہوگی۔ چاہے اسے عقیدت یا روایت کے کتنے ہی سہارے دیئے جائیں۔ کیونکہ مطلوب و مقصود کے واضح تعین کے بعد کوئی ایسی تشریح جو خود اس مقصود کی ہی نقیض ہو جائے ہرگز قابل ستائش نہیں ہو سکتی اور تشریح کنندہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی تشریح پر دوبارہ غور کرے اور اسے مقصود متن سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرے۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں تفسیر تفہیم القرآن چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ انڈکس اور فہرست مضامین کو چھوڑ کر یہ تین ہزار آٹھ سو پینتیس صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب تیس سال کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اور بقول اسعد گیلانی صاحب کے جو مودودی صاحب کے متبعین میں سے ہیں یہ مودودی صاحب کی علمی زندگی اور اسلام کے بارے میں ان کے "جامع" اور "وسیع" تصور کا پورا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ اور کہ اس سے باہر مودودی صاحب کی فکر کا کوئی گوشہ موجود نہیں۔ ایک ایسی ضخیم تصنیف کے بارے میں تفصیلاً لکھنا بہت وقت طلب بھی ہوتا اور طویل بھی۔ اس لئے ہم نے مختصراً صرف انہی بعض مقامات کے بارے میں کچھ عرض کرنا مناسب سمجھا ہے جہاں ہمیں مودودی صاحب کی بیان کردہ وضاحت سے پوری پوری تسلی نہیں ہوئی، جہاں اشکال باقی رہ گیا ہے۔ ہمارا مطالعہ خالص طالب علمانہ ہے۔ ہمیں مودودی صاحب کی کتاب پر نہ تو کوئی ریویو کرنا ہے نہ تنقید نہ محاکمہ کرنا ہمارا منصب ہے نہ مناظرہ مقصود۔ بلکہ مودودی صاحب نے جس نیک نیتی سے لکھا ہے:۔

بہر حال یہ حرف آخر نہیں ہے۔ ہر ناظر سے میری درخواست ہے کہ جہاں کوئی تشنگی محسوس ہو یا کسی سوال کا جواب نہ ملے یا مدعا اچھی طرح واضح نہ ہو رہا ہو اس سے مجھے مطلع کیا جائے تاکہ میں اس خدمت کو زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکوں۔" (ایضاً جلد اول ص۶)

اسی سنجیدگی اور پوری نیک نیتی سے ہم ان کی توجہ ان بعض باتوں کی طرف دلانا چاہتے ہیں جہاں ہمیں ابہام یا اشکال یا عدم تسلی کا احساس ہوا ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری معروضات کو اسی خلوص سے زیر غور لایا جائے گا جس سے ہم عرض کر رہے ہیں۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہمارا شمار مودودی صاحب کی تفسیر کے انہیں قارئین کی صف میں ہے جنہیں اوسط درجے کا تعلیم یافتہ اور عربی سے اچھی طرح واقف نہیں کہہ کر بیان کیا گیا ہے ہم ہرگز ان علمائے کرام میں شمار نہیں ہوتے جن کو "میری غلطیوں سے آگاہ فرمائیں"، کی دعوت خود مودودی صاحب نے دی ہے۔

جیسا کہ ہم شروع میں عرض کر آئے ہیں مودودی صاحب نے تفسیر کی اس کوشش کا جواز یہی بیان فرمایا ہے کہ گذشتہ تفاسیر میں جو کوئی کمی رہ گئی تھی یا کسر تھی وہ اس تفسیر میں دور کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ہم بصد ادب عرض کریں گے کہ ہمارا تاثر مودودی صاحب کی تفسیر پڑھنے کے بعد یہ نہیں ہے۔ بڑی حد تک ہمیں مودودی صاحب کی تفسیر پرانی روایات کی تکرار ہی محسوس ہوئی ہے۔ ہاں صرف اس حد تک فرق ضرور ہے کہ اس میں زور قلم شوکت الفاظ کے بل پر اس پرانی روایت کو یا تو معقول یا عین حسین دکھانے پر صرف ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں سبت کا قانون توڑنے والے یہودیوں کا ذکر کر کے قرآن پاک نے فرمایا: "فقلنا لھم کونوا قردۃ خاسئین ۶۵" اس پر نوٹ دیتے ہوئے مودودی صاحب نے لکھا ہے:۔

"بندر بنائے جانے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی اور بعض یہ معنی لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا ہو گئی تھیں لیکن قرآن کے الفاظ اور انداز بیان سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخ اخلاقی نہیں جسمانی تھا۔ میرے نزدیک قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہٖ اسی حال میں رہنے دیئے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندروں کے سے ہو گئے ہوں گے۔" (جلد اول صفحہ ۸۴)

وہ تو خیریت ہے کہ انہوں نے بندروں کے سے کہہ دیا۔ ورنہ ترجمہ تو "بندر بن جاؤ"، ہی کیا گیا ہے

چنانچہ اسی حاشیہ میں سورہ الاعراف کے رکوع ۲۱ کا حوالہ دیا ہے کہ اس واقعہ کی تفاصیل وہاں بیان ہوئی ہیں۔ اور وہاں حاشیہ ۱۲۶ میں اسی حاشیہ ۸۳ کا حوالہ دیا ہے۔ چنانچہ سورہ الاعراف کے حاشیہ ۱۲۵ میں لکھا ہے کہ:۔

"مزید برآں جو آیات اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی پر خدا کا عذاب دو قسطوں میں نازل ہوا تھا۔ پہلی قسط وہ جسے عذاب بئیس (سخت عذاب) فرمایا گیا اور دوسری قسط وہ جس میں نافرمانی پر اصرار کرنے والوں کو بندر بنا دیا گیا۔ ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ پہلی قسط کے عذاب میں دونوں گروہ شامل تھے اور دوسری قسط کا عذاب صرف پہلے گروہ کو دیا گیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ان اصبت فمن اللہ و ان اخطئت فمن نفسی۔ واللہ غفور رحیم"۔ (جلد دوم صـ۹۲)

کیا پرانے روایتی مترجم اور مفسر اس کے علاوہ کچھ اور کہتے ہیں؟

حالانکہ سورۃ النساء کی آیت ۴۷ میں جہاں سبت کے توڑنے والوں کی سزا کا پھر یہ ذکر ہے اور کہا گیا ہے "او نلعنھم کما لعنا اصحاب السبت"، وہاں نوٹ نمبر ۸۷ میں مودودی صاحب نے بغیر کچھ مزید حاشیہ لکھنے کے سورۃ بقرۃ کے حاشیہ ۸۲ اور ۸۳ کا حوالہ دیا ہے حالانکہ سورۃ النساء کی یہ آیت سورۃ بقرہ کی کیفیت کو سمجھنے میں بہت ممد ہو سکتی ہے۔ سورہ النساء کی محولہ بالا آیت میں اہل کتاب کو جو ہمارے حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضور کے مخاطب تھے کہا گیا ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ ورنہ کہیں:۔

"ہم (تمہارے) چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں یا ان کو اسی طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا اور یاد رکھو اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے"۔ (ترجمہ مودودی صاحب۔ جلد اوّل صـ۳۵۸)

اب یہ تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اہل کتاب یہود حضور پر ایمان نہ لائے اور ان پر اللہ کا عذاب اترا۔ وہ ذلیل و خوار اور خائب و خاسر ہی ہوئے۔ نہ تو ان کے چہرے بگاڑ کر الٹے کر دیئے گئے اور نہ ہی انہیں بندروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔ کیا سورۃ النساء کی اس آیت کی روشنی میں سورۃ البقرہ کی محولہ بالا آیت میں بھی ان یہودیوں کا جو سبت کا قانون توڑنے کے مرتکب ہوئے تھے مسخ اخلاقی اور معنوی مراد لینا زیادہ درست نہیں اور کیوں مسخ جسمانی ہی کو ترجیح دی جائے۔

اسی طرح سورہ البقرہ کی آیت "واذ قتلتم نفسا فادرئتم فیھا۔ واللہ مخرج

ماکنتم تکتمون،، پر حاشیہ نمبر ۸۵ لکھا ہے :۔

"اس مقام پر یہ بات تو بالکل صریح معلوم ہوتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لئے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتہ بتادے لیکن اس غرض کے لئے جو تدبیر بتائی گئی تھی یعنی لاش کو اس کے ایک حصے سے ضرب لگائے اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مفسرین نے بیان کیا ہے۔" (جلد اول صفحہ ۸۶)

ظاہر ہے کہ جب بنی اسرائیل کی زیادتیوں کو گنا جارہا ہے تو یہ بھی ضرور کوئی اہم واقعہ انہی سے متعلق ہوگا جو اسے قرآن پاک نے خاص طور پر یہاں بیان کیا۔ لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اتنے اہم واقعہ میں نہ مقتول کا علم ہے نہ آئندہ نسلوں کے پاس اس واقعہ کا کوئی تاریخی ثبوت محفوظ ہے اور نہ کبھی اس کے بعد ایسا معجزہ دہرایا گیا کہ کسی مقتول کی لاش کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے مارا گیا یا اس لاش پر گائے ذبح کرکے اس کے گوشت سے مقتول کی لاش کو ضرب لگائی گئی اور جان لوٹ کر اس مقتول میں آگئی اور مقتول قاتل کا پتا بتا گیا۔ حالانکہ اس تمام واقعہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کذالک یحی اللہ الموتیٰ ۲:۷۳ ویریکم ایٰتہ لعلکم تعقلون قرآن پاک کے مشکل مقامات میں سے یہ بھی ایک مقام ہے لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تفسیر تفہیم القرآن اس الجھاؤ کو سلجھانے میں ہماری کوئی امداد نہیں کرتی۔ بلکہ خود مودودی صاحب کا اعتراف ہے کہ اس کے الفاظ میں کچھ ابہام سا محسوس ہوتا ہے۔" پھر خود ہی انہوں نے پرانے مفسرین کی تشریح کو قریب ترین مفہوم قرار دے دیا کہ چونکہ یہ واقعہ گائے کے ذبح کرنے کے بعد کا ہے چنانچہ اس گائے کے گوشت سے مقتول کو ضرب لگائی گئی :۔

اور اس طرح گویا بیک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ کی قدرت کا ایک نشان انہیں دکھایا گیا اور دوسرے گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبودیت پر بھی ایک کاری ضرب لگی کہ اس نام نہاد معبود کے پاس اگر کچھ طاقت ہوتی تو اسے ذبح کرنے سے ایک آفت برپا ہوتی نہ کہ اس کا ذبح ہونا الٹا مفید ثابت ہو،،

اس قسم کی تشریح میں محل نظر بات جمع مخاطب کا صیغہ "قتلتم" ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک شخص کا قتل اس وقت تک پوری قوم کو قابل الزام نہیں گردان سکتا جب تک کہ اس کے قتل پر پوری قوم کے اکابر متفق نہ ہوئے ہوں اور ظاہر ہے کہ وہ تبھی قتل کہلائے گا جب کہ وہ ناحق ہو۔ پھر کیوں تعجب نہ ہو کہ پورے بنی اسرائیل

کو اس کے لیے مورد الزام ٹھہرایا جارہا ہے لیکن نہ بائبل میں اور نہ ہی قرآن پاک میں اس مقتول کی نشان دہی کی گئی ہے :۔

پرانی تفسیر کی باتوں میں بھی یہی قصہ بیان کیا گیا ہے جس کا مودودی صاحب نے مختصراً اشارہ کیا ہے لیکن وہ خود اس میں ابہام محسوس کرتے ہیں ۔ یہاں بھی تفسیر تفہیم القرآن نے نہ صرف یہ کہ گذشتہ تفاسیر کی کمی کو دور نہیں کیا بلکہ اسی کمی کی پیروی کی ہے ۔

ہم نے ایک اور بات جو مودودی صاحب کی تفسیر میں محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ بعض مقامات پہ ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے کہ کسی واقعہ کا ہونا فرض کر لیا گیا ہے اور پھر اسی فرض کو حقیقت سمجھ کر باقی تمام عمارت تصوراتی سہاروں پہ تعمیر کر دی گئی ۔ مثلاً ہاروت ماروت کے بارے میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۲ پہ حاشیہ نمبر ۱۰۵ میں یہ فرض کر کے کہ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کے ذریعے بنی اسرائیل کو " آزمانا چاہا ہوگا" روایتی تفسیر کو ہی قبول کر لیا گیا ہے ۔ پھر اس الجھن سے نکلنے کے لئے کہ اگر ہاروت ماروت کو تعلیم سحر پہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض امتحاناً بھی مامور نہ تسلیم کر لیا جائے تو اس سے ایک برے کام کی تعلیم و تبلیغ کا جواز نکل آتا ہے جو بجائے خود ایک قابل اعتراض صورت حال ہے ۔ مودودی صاحب کو کہنا پڑا کہ یہ تو ایسا ہے جیسے رشوت خوروں کو پکڑنے کے لئے بے وردی سپاہی نشان زدہ سکّے دے رہے ہوں ۔ لیکن تعجب ہے کہ اللہ پاک کے نزدیک سحر کا سیکھنا یا سکھانا شیاطین کا کام ہے اور خود مودودی صاحب کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک برا فعل ہے تو پھر وہ خدا کے رحیم و کریم جو ہمیشہ انسانوں کو گمراہی سے نکالنے کے لئے انبیاء اور رسل بھیجتا رہا اور اس نے ہمیشہ انسانوں کی امداد ہی کی اس پہ انسانوں کو نعوذ باللہ بہکانے کے لئے فرشتوں کے بھیجنے کا اہتمام کرنے کا گمان بھی بہت بڑی زیادتی ہوگا ۔ مودودی صاحب کا یہ کہنا ہے کہ :۔

"فرشتوں نے بازار ساحری میں اپنی دوکان لگائی ہوگی اور دوسری طرف وہ اتمام حجت کے لئے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمہارے لئے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو ۔" (جلد اوّل صفحہ ۹۵)

کسی طرح بھی اس زیادتی میں کمی نہیں کرتا جو اس طرح کے استدلال سے رحیم و کریم خدا پہ ہو جاتی ہے ۔ کیا کبھی کسی نشان زدہ سکّہ دینے والے نے رشوت خور ملازم کو اپنے منہ سے کہا ہے کہ دیکھو میں تمہارے

لئے آنہ مائش ہوں مجھ سے سکّہ قبول کرو گے تو پکڑے جاؤ گے کیونکہ میں تو دراصل بے وردی سپاہی ہوں ۔ الزام تو یہ تھا کہ سحر کی تعلیم فرشتوں نے بابل میں دی جو ہاروت ماروت کا نام رکھتے تھے ۔ جواباً اگر یہ کہا جائے کہ ہاں تعلیم تو فرشتوں نے ہی دی تھی مگر تم نے لی کیوں؟ وہ تو ایک امتحان تھا ۔ تو بتایئے اس سے مصدر تعلیم کے ثقہ ہونے میں کیا فرق پڑا ۔ جواب تو تبھی درست ہو گا اگر اسے نفی میں کہا جائے کہ ایسی تعلیم کوئی دی ہی نہیں گئی اور نہ ایسا کرنا فرشتوں کو سزاوار ہے ۔

مودودی صاحب قرآن پاک میں ناسخ منسوخ کے قائل ہیں اسی لئے فرضیتِ صیام کی آیات میں وہ ایک حکم کے ذریعے دوسرے حکم میں دی گئی "رعایت" کو منسوخ شدہ تسلیم کرتے ہیں ۔ چنانچہ **سورۃ البقرہ** کی ایک آیت ۱۸۴ پر حاشیہ ۱۸۳ لکھتے ہوئے انہوں نے کہا ہے :-

"سنہ ۲ھ میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں ۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا اور عام رعایت منسوخ کر دی گئی لیکن مریض اور مسافر اور حاملہ دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڈھے لوگوں کے لئے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا ۔ اور انہیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں جتنے رمضان میں ان سے چھوٹ گئے ہوں" (جلد اوّل ص۱۴۱)

ہمیں حیرت ہے کہ جس رعایت کا ذکر اس حاشیہ میں کر کے پھر کسی دوسرے حکم سے منسوخ قرار دلوایا گیا ہے خود اس رعایت کو دوبارہ حاملہ عورتوں اور بڈھوں کے لئے کہاں سے اخذ کر لیا گیا ہے ۔ جب کہ دوسری مرتبہ یہ رعایت سرے سے ہٹ جانا قرار دے دی گئی ہے اور مریضوں اور مسافروں کو **فعدۃ من ایام اخر** مکلف کر دیا گیا ۔ متن میں تو "**وعلی الذین یطیقونہ**" کا ترجمہ "اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں)" کیا گیا ہے ۔ قوسین میں درج شدہ عبارت "پھر نہ رکھیں" تو آیت میں کہیں بھی نہیں یہ الفاظ مودودی صاحب کو اس لئے داخل کرنے پڑے کہ اس ترجمے کی روشنی میں جو انہوں نے **یطیقونہ** کا کیا ہے ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا ورنہ آیت کے معنی عجیب سے ہو جاتے تھے کیونکہ اس کے بعد متواصلاً الفاظ "**فدیۃ طعام مسکین**" کے آتے ہیں

اب اگر اسے قوسین میں درج شدہ الفاظ کے بغیر مودودی صاحب والے ترجمے سے دیکھا جائے تو صورت حال یہ بنتی ہے:۔

"اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے"۔ لہٰذا

ظاہر ہے کہ اس سے آیت کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اسی لئے مجبوراً انہیں قوسین میں کچھ الفاظ اپنے آپ سے داخل کرنے پڑے لیکن جب ان کے قریب کے الفاظ اس کے بعد شہر رمضان والی آیت میں نظر نہیں آئے تو کہہ دیا کہ وہ عام رعایت منسوخ ہو گئی۔ اگر وہ رعایت واقعی منسوخ ہو گئی ہے تو حاملہ عورتوں، دودھ پلانے والی ماؤں اور عورتوں یا بڈھوں سے لئے جس استثناء یا رعایت کا ذکر انہوں نے حاشیہ ۱۸۳ میں کیا ہے اس کی سند وہ کہاں سے لائے ہیں۔ یطیقونہ، تو ان کے نزدیک روزے کی قدرت رکھنے والے ہیں۔ حاملہ عورتیں دودھ پلانے والی مائیں یا بڈھے لوگوں کے بارے میں تو دونوں جگہ خاموشی ہے کیونکہ حاملہ عورتیں، دودھ پلانے والی مائیں اور بڈھے بہر حال بیماروں یا مسافروں کے ذیل میں نہیں آتے۔ یہ الجھن دراصل یطیقونہ، کا ترجمہ قدرت رکھتے ہوں کرنے کے سبب پیدا ہوئی ہے حالانکہ اگر اس کا مفہوم یہ لیا جائے کہ جنہیں روزہ رکھنے میں مشقت کا سامنا ہو تو وہ فدیہ دے دیں تو وہ تمام استثنائی حالتیں جو مودودی صاحب نے گنوائی ہیں خود بخود اس میں آجاتی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ مودودی صاحب نے جس کو عام رعایت کہا ہے وہ دراصل عام رعایت تھی ہی نہیں۔ وہ شروع سے ہی خاص رعایت تھی۔ اسی لئے دوسری بار شہر رمضان والی آیت کے بعد دوہرایا نہیں گیا کیونکہ جب ایک بار اس کا ذکر کر دیا گیا تو پھر اس خاص استثنائی حالت کو دہرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مودودی صاحب کو تسلیم ہے کہ فرضیتِ صیام کی یہ آیت ۲ھ میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئی اور اس کے بعد کی آیات اس کے ایک سال بعد نازل ہوئیں لیکن مناسبت مضمون کے باعث اسی سلسلہ بیان میں شامل کر دی گئیں۔ وہ آیات جو ایک سال بعد نازل ہوئیں شاید "شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن" سے شروع ہوتی ہیں۔ مودودی صاحب نے حاشیہ ۱۸۶ میں لکھا ہے کہ جنگ کے موقع پر تو آپؐ نے حکماً روزہ سے روک دیا تھا:۔

حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ ہم نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو مرتبہ رمضان شریف میں جنگ پر گئے پہلی مرتبہ جنگ بدر میں اور آخری مرتبہ فتح مکہ کے موقعہ پر اور دونوں مرتبہ ہم نے روزے چھوڑ دیئے ابن عمر کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ انہ یوم قتال فانطرو" (ص ۱۴۲)

ظاہر ہے کہ فرضیت صیام کی یہ آیت جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئی تھی اور اس میں یہ الفاظ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ کی رعایت موجود تھی لیکن فتح مکہ تک دوسرا حکم جس سے مودودی صاحب عام رعایت کی منسوخی پر استدلال کرتے ہیں نازل ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود دونوں موقعوں پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یوم قتال میں روزہ رکھنے سے منع کرنا اس بات کا غماز نہیں کہ حضور کے نزدیک ایسا کرنے کی اجازت جناب الٰہی سے دی گئی تھی۔ قرآن پاک میں یوم قتال روزہ نہ رکھنے کا استثنا ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ یوم قتال پر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک ہی طرح کا دو مختلف موقعوں کا عمل جس کے درمیان تقریباً چار سال سے زائد کا وقفہ ہے کیا اس بات کا شاہد نہیں کہ وہ پہلے حکم میں دی گئی کسی رعایت کو منسوخ نہیں سمجھتے تھے۔ یوں ناسخ و منسوخ کے جس غلط اصول کو کتاب اللہ میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی اس کی کوئی سند موجود نہیں مودودی صاحب نے اس اصول کو مان کر بھی پرانے ہی تفسیر نویسوں کا اتباع کیا ہے۔

مسئلہ طلاق پر بھی مودودی صاحب نے روایتی مذہب کو ہی اختیار کیا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں ایک ہی نشست میں تین طلاق دینے سے بھی طلاق بائن ہو جاتی ہے جس سے رجوع بجز ایک اور آدمی سے نکاح اور طلاق ہو جانے کے ممکن نہیں۔ اور اسی صورت حال سے نپٹنے کے لئے حلالہ کا طریق ایجاد کیا گیا ہے۔ مودودی صاحب اس ضمن میں لکھتے ہیں :۔

"رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے ڈالی جائیں جیسا کہ آج کل جہلا کا عام طریقہ ہے تو یہ شریعت کی رو سے سخت گناہ ہے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے اور حضرت عمرؓ سے یہاں تک ثابت ہے کہ جو شخص بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا ہے آپ اسے درے لگاتے تھے تاہم گناہ ہونے کے باوجود آئمہ اربعہ کے نزدیک تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ اور طلاق مغلظ ہو جاتی

ہے۔" (جلد اوّل ص۔۔۔)

یہ صورت حال ہمارے لئے بہت ہی عجیب و غریب ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شئے گناہ بھی ہو اور نافذ العمل بھی۔ اس سے وہی نتائج بر آمد ہوں جو عام صحیح صورت حال سے بر آمد ہونے چاہئیں ہم نے تو قانون وضعی (SECULAR - LAW) میں اس اصول کو دیکھا ہے کہ جو معاملہ قانوناً واقع نہ ہو سکتا ہو وہ چاہے کسی بھی حیلہ سے برپا کیا جائے وہ ساقط العمل (NULL - AND - VOID) ہوتا ہے شریعت میں تو اس پر گناہ کا اضافہ بھی ہے۔ یوں جو شریعت میں گناہ ہو اس سے اس طرح کے قانونی واجبات کس طرح جاری ہو سکتے ہیں جس طرح کے حالت صواب میں جاری ہوتے ہیں۔ نکاح اور زنا دو مختلف صورتیں ہیں۔ دونوں کے واجبات اور مقتضیات الگ الگ ہیں اس لئے دونوں کے احکامات الگ الگ ہیں دونوں کو ایک طرح کی حالت سمجھنا ایک لا اخلاقی AMORAL انسان کے نزدیک تو شاید درست ہو ایک مسلمان عالم دین کے نزدیک تو بجا نہیں ہو سکتا۔ جب حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے فعل کی مذمت کی ہے۔ شریعت مطہرہ کے نزدیک ایسا کرنا گناہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس پر درے لگاتے تھے۔ پھر یہ فعل شریعت میں وہ نتائج کیونکر پیدا کر سکتا ہے۔ جو صحیح طریق پر دی گئی طلاق مغلظہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

مودودی صاحب نے سورۃ الطلاق کے تحت بہت تفصیلی بحث اس موضوع پر کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ وہ لوگ جو ایک نشست میں دی جانے والی تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کرتے ہیں وہ درست نہیں لیکن عجیب بات ہے کہ وہ احادیث حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے وہی استنباط کرنا چاہتے ہیں جو احادیث نہیں چاہتیں۔ مثلاً ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں بیک وقت دے دیں۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایلعب بکتاب اللہ وانا بین اظھرکم۔ اور سخت غصے میں کھڑے ہو گئے یا ایک اور نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دے دی اور حضور نے فرمایا۔ بانت منہ بثلاث فی معصیۃ اللہ تعالیٰ وبقی تسع مائۃ وسبع وتسعون ظلما وعدوانا۔ ان شاء اللہ عذبہ وان شاء غفر لہ۔ کیا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ حضور ایسے لوگوں کی عدم سمجھ پر غصہ فرما رہے تھے کہ یہ کتاب اللہ میں بیان کردہ تین طلاق

کا مطلب ہی نہیں سمجھے۔ ورنہ ہزار طلاق کا مطلب کیا؟ اسی طرح رکانہ بن عبد یزید کے معاملہ میں حضور نے پوچھا کہ کیا اس کی نیت ایک ہی طلاق دینے کی تھی اور جب اس نے حلفاً کہا کہ ہاں تو حضور نے اسے رجوع کا حق دے دیا۔

مودودی صاحب نے مانا ہے کہ طاؤس اور عکرمہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ بیک وقت تین طلاقیں دی جائیں تو صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے اور اس رائے کو امام ابن تیمیہ نے بھی اختیار کیا ہے ان کی رائے کا ماخذ یہ روایت ہے کہ ابو الصہبا نے ابن عباس سے پوچھا "کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور میں تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا" انہوں نے کہا کہ ہاں (بخاری ومسلم) لیکن یہ بات مودودی صاحب کے نزدیک کئی وجوہ سے قابل قبول نہیں کیونکہ بعد میں جو حضرت عمرؓ نے تین طلاق کو طلاق بائن قرار دے دیا ممکن نہ تھا کہ حضرت عمرؓ سنت کے خلاف کوئی فیصلہ کرتے۔ اور کہ خود ابن عباس کا فتوے یک نشستی تین طلاق کو طلاق بائن شمار کرنے کا ہی تھا۔ اولاً کسی بھی فتوے کے لئے اس مخصوص صورت حال کا علم ہونا ضروری ہے جس میں فتوے دیا گیا ہو اور ثانیاً اگر بالفرض حضرت عمرؓ نے یک نشستی تین طلاق کو "تعزیراً" کسی غلط رجحان کو روکنے کے لئے طلاقِ بائن بھی قرار دے دیا تو اسے دائمی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی کیا خود مودودی صاحب نے نہیں کہا ہے کہ :۔

ابتدائی دور میں چونکہ لوگوں کے اندر دینی معاملات میں خیانت قریب قریب مفقود تھی اس لئے تین طلاق دینے والے کے اس بیان کو تسلیم کر لیا جاتا تھا کہ اس کی اصل نیت ایک طلاق دینے کی تھی اور باقی دو طلاقیں محض پہلی طلاق پر زور دینے کے لئے اس کی زبان سے نکلی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے جب دیکھا کہ لوگ پہلے جلد بازی کر کے تین تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں اور پھر تاکید کا بہانہ کرتے ہیں تو انہوں نے اس بہانے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔" (تفہیم القرآن جلد پنجم صفحہ ۵۶۲)

تعجب ہے کہ جب وہ حضرت عمرؓ سے خلافِ سنت فیصلہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تو پھر کس طرح خود ہی دوسرے لمحے حضرت عمرؓ کے ایک ایسے ہی عمل کو بیان کر رہے ہیں۔ جس میں انہوں نے

لوگوں سے اس قول کو ماننے سے انکار کر دیا جس کو حضور قبول کرتے رہے دل کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ عمومی طور پر تو شریعت ظاہر پر ہی فیصلہ کرتی ہے۔ اگر محض تین طلاق کے الفاظ ایک نشست میں طلاق بائن کا حکم رکھتے ہیں تو پھر اصل نیت کا کیا مقام رہ جاتا ہے اور یہ کیسے قبول کیا جا سکتا ہے کہ باقی دو لفظوں کی تکرار محض زور دینے کے لئے تھی؟ صاف ظاہر ہے کہ جب حضورؐ نے اس بات کو قبول کیا ہے کہ محض تکرار لفظی کسی صورت حال کو واقع نہیں کر سکتی جب تک کہ نیت میں وہ مقصد نہ ہو تو پھر ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ظاہری قول کو قبول نہ کریں اور یہ کہہ کر کہ لوگوں کی دینی حالت اب پہلے سی نہیں رہی ہر کس و ناکس پر ایک ہی حکم نافذ کر دیں۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ تین طلاق آخر شریعت میں رکھی کیوں گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب بھی زوجین کی باہمی رنجش کا نتیجہ خاوند کی طرف سے طلاق کے اعلان میں ہوگا اس وقت خاوند نفسیاتی طور پر بیوی کو اپنے سے قطعی طور پر جدا ہی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوگا۔ اگر اس کی نیت رجعت کی ہوگی اور بیوی کو بھی علم ہو کہ یہ تو محض ڈراوا ہی ڈراوا ہے تو اس صورت حال کے درست ہونے کے بعد میں کسی نفسیاتی تبدیلی کے نتیجے میں رجوع کرنے کا کوئی مقام ہی نہیں رہتا کیونکہ اس نفسیاتی کیفیت میں جب خاوند اپنی بیوی کو طلاق جیسے اقدام کا سزاوار سمجھتا ہو وہ اگر پچاس بار بھی لفظ طلاق دہرا دے تو ممکن ہے جبھی تو مودودی صاحب نے ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دی ہے۔ حضرت علیؓ سے ایک اور نے ایسا ہی کہا تو حضرت علیؓ نے کہا کہ تین طلاق سے تو وہ تجھ سے جدا ہو گئی باقی طلاقوں کو اپنی دوسری عورتوں پر تقسیم کرتا پھر۔" (تفہیم القرآن جلد پنجم ص۵۵۶)

کیا کوئی آدمی حضرت علیؓ کے اس قول سے وہ مفہوم لے سکتا ہے جو مودودی صاحب چاہتے ہیں۔

کیا اس شخص کی باقی عورتیں بھی اس فعل کے نتیجے میں طلاق شدہ مانی جائیں ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے تعزیراً ایسا کیا ہو کہ یک نشستی تین طلاق کو طلاقِ بائن قرار دے دیا۔ لیکن حضرت علیؓ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت زبیر بن العوامؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اسے ایک ہی طلاق قرار دیا۔

المدخل لدراسۃ الفقہ الاسلامی للدکتور محمد یوسف موسیٰ ص۱۲۲

اور امام ابن تیمیہؒ نے بھی ایسا مانا جو مودودی صاحب کو تسلیم ہے۔

معجزات اور نشانات کی بحث میں مودودی صاحب کا موقف بہت کچھ الجھ سا گیا ہے۔ وہ

ایک طرف تو روایت کی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف معجزات اور نشانات کے صدور کو اس اصلاحی سکیم سے یکسر خارج بھی سمجھتے ہیں جس کے تحت نبی اپنے دور کے مخاطبوں اور اپنے معاصرانہ سماج کو بدلنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ ان تمام لوگوں کو جو معجزہ یا نشان کی تاویل کرتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ بہتر یہی ہے کہ تم سرے سے قرآن ہی کا انکار کر دو۔

"معجزات کے باب میں اصل فیصلہ کن سوال صرف یہ ہے کہ آیا اللہ تعالےٰ نظام کائنات کو ایک قانون پر چلا دینے کے بعد معطل ہو چکا ہے اور اب اس چلتے ہوئے نظام میں کبھی کسی موقع پر مداخلت نہیں کر سکتا؟ یا وہ بالفعل اپنی سلطنت کی زمام تدبیر و انتظام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور ہر آن اس کے احکام اس سلطنت میں نافذ ہوتے ہیں اور اس کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ اشیاء کی شکلوں اور واقعات کی عادی رفتار میں جزئی طور پر یا کلی طور پر جیسا چاہے اور جب چاہے تغیر کر دے؟ جو لوگ اس سوال کے جواب میں پہلی بات کے قائل ہیں۔ ان کے لئے معجزات کو تسلیم کرنا غیر ممکن ہے کیونکہ معجزہ نہ ان کے تصور خدا سے میل کھاتا ہے اور نہ تصور کائنات سے۔ لیکن ایسے لوگوں کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ قرآن کریم کی تشریح و تفسیر کرنے کے بجائے اس کا صاف صاف انکار کر دیں۔ (تفسیر تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۶۶)

یعنی ضروری ٹھہرا کہ قرآن پر ایمان لانے کے لئے معجزوں پر اسی طرح ایمان لایا جائے جس طرح کہ کوئی ایک صاحب ان کا صادر ہونا تسلیم کرتے ہیں۔ یہ تو ایک انتہا پسندانہ مؤقف ہے لیکن مودودی صاحب صرف ایسے لوگوں کے بارے میں ہی اتنے متشدد نہیں جو اشیاء کی عادی شکلوں یا واقعات کی عادی رفتار میں اب اللہ تعالےٰ کے جزئی یا کلی دخل کو غیر ضروری سمجھ کر معجزوں کے ضرورت کے قائل نہیں رہے۔ بلکہ وہ ان لوگوں کو بھی گوارا نہیں کرتے جو معجزوں اور نشانات کی کوئی ایسی تشریح کرتے ہوں جو ان کی خرق عادت حیثیت کو بدل دیتی ہے :-

"ایسے نشانات یا معجزات کو جو لوگ قوانین فطرت کے تحت صادر ہونے والے عام واقعات قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ درحقیقت کتاب اللہ کو ماننے اور نہ ماننے کے درمیان ایک ایسا موقف اختیار کرتے ہیں جو کسی طرح معقول نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لئے کہ قرآن

جس جگہ صریح طور پر خارق عادت واقعہ کا ذکر کر رہا ہو وہاں سیاق و سباق کے بالکل خلاف ایک عادی واقعہ بنانے کی جد و جہد محض ایک بھونڈی سخن سازی ہے جس کی ضرورت صرف ان لوگوں کو پیش آتی ہے جو ایک طرف تو کسی ایسی کتاب پر ایمان لانا نہیں چاہتے جو خارق عادت واقعات کا ذکر کرتی ہو اور دوسری طرف آبائی مذہب سے پیدائشی معتقد ہونے کی وجہ سے اس کتاب کا انکار بھی نہیں کرنا چاہتے جو فی الواقع خارق عادت واقعات کا ذکر کرتی ہے"۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۶۵)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ محض اس وجہ سے کہ وہ لوگ ان مقامات کی تشریح مودودی صاحب کے مفہوم معجزہ سے مختلف کرتے ہیں اس لئے قرآن پاک کو چھوڑ دیں۔ یہ تحریص ہمارے لئے ناقابل فہم ہے۔ وہ لوگ بھی تو خدا تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے انکاری نہیں ان کا تو صرف یہ موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نہیں توڑتے۔ قانون بھی تو آخر انہی کا بنا ہوا ہے کیا وہ اپنی جگہ پر کچھ کم حیرت انگیز ہے؟

وہ لوگ جو معجزات یا نشانات کو قوانین الٰہی ہی کا ایک ان دیکھا یا ان سنا یا ان ہی کے تحت بسا اوقات ہو جانے والا ظہور قرار دیتے ہیں جو کسی نبی کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے خدا کے پاک کے حکم سے اس مخصوص ظہور معجزہ کے وقت الٰہی قوانین کے تحت صادر ہو گیا تو یہ ان کی ایک تفسیری تشریح ہی تو ہے ظہور نشان یا معجزہ سے اس طرح تو وہ بھی انکاری نہیں ہوتے ان پر ناراض ہو کر انہیں سرے سے ہی قرآن چھوڑ دینے کی ترغیب دلانا ہمارے نزدیک درست نہیں۔

لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ آخر یہ معجزات اور نشانات ہوتے کس لئے ہیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

"پیغمبروں نے جب کبھی اپنے آپ کو فرستادہ رب العلمین کی حیثیت سے پیش کیا۔ تو لوگوں نے ان سے یہی مطالبہ کیا کہ اگر تم واقعی رب العلمین کے نمائندے ہو تو تمہارے ہاتھوں سے کوئی ایسا واقعہ ظہور میں آنا چاہیے جو قوانین فطرت کی عام روش سے ہٹا ہوا ہو اور جس سے ظاہر ہو رہا ہو کہ رب العلمین نے تمہاری صداقت ثابت کرنے کے لئے اپنی براہ راست مداخلت سے یہ واقعہ نشانی کے طور پر صادر کیا ہے۔ اس مطالبہ کے جواب میں انبیاء نے وہ نشانیاں دکھائی

ہیں جن کو قرآن کی اصطلاح میں آیات اور متکلمین کی اصطلاح میں معجزات کہا جاتا ہے۔" (ایضاً صفحہ ۶۵)

چنانچہ اس کا مقصد یہ ہوا کہ معجزات پیغمبروں کے ادعاک اعتماد کی حیثیت سے پیش کئے گئے۔ لیکن:۔

"صلے اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے تھے کہ اس قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مدتیں گذر گئی ہیں اور کسی طرح یہ راستی پر نہیں آتی تو بسا اوقات آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش کوئی نشانی خدا کی طرف سے ایسی ظاہر ہو جس سے ان لوگوں کا کفر ٹوٹے اور یہ میری صداقت تسلیم کر لیں۔ آپ کی اس خواہش کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے صبری سے کام نہ لو جس ڈھنگ اور جس ترتیب و تدریج پر ہم اس کام کو چلوا رہے ہیں اس پر صبر کے ساتھ چلے جاؤ۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو کیا ہم خود نہ لے سکتے تھے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ جس فکری و اخلاقی انقلاب اور جس مدنیت صالحہ کی تعمیر کے کام پر تم مامور کئے گئے ہو اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے۔ تاہم اگر لوگوں کے موجودہ جمود اور ان کے انکار کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا اور تمہیں گمان ہے کہ اس جمود کو توڑنے کے لئے کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرنا ضروری ہے تو خود زور لگاؤ اور تمہارا بس چلتا ہو تو زمین میں گھس کر یا آسمان پر چڑھ کر کوئی ایسا معجزہ لانے کی کوشش کرو جسے تم سمجھو کہ یہ بے یقینی کو یقین میں تبدیل کر دینے کے لئے کافی ہوگا۔ مگر ہم سے امید نہ رکھو کہ ہم تمہاری یہ خواہش پوری کریں گے۔ کیونکہ ہماری اسکیم میں اس تدبیر کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔" (تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۵۳۵-۵۳۶ء)

یہ تو تھا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے احترام میں جواب اب عمومی طور پر کہا گیا ہے کہ:۔

"اللہ تعالےٰ محض اپنی قدرت قاہرہ کے زور سے افکار فاسدہ کو مٹا کر لوگوں میں فکر صالح پھیلا دے اور تمدن فاسد کو نیست و نابود کر کے مدنیت صالحہ تعمیر کر دے تو ایسا ہرگز نہیں ہوگا کیونکہ یہ اللہ کی حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اس نے انسان کو دنیا میں ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔۔۔۔۔۔ اور اس کی سعی کے مطابق جزا اور سزا دینے کے لئے فیصلہ کا ایک

وقت مقرر کر دیا'' (ایضاً صفحہ ۳۶۵)

یعنی اصولی طور پر بھی خدا تعالےٰ اپنی قوت قاہرہ کو مدنیت صالحہ کے برپا کرنے کو استعمال نہیں کرتے کیونکہ یہ اللہ کی حکمت کے خلاف ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ نشانات کے عدم ظہور پر یہ فرماتے ہیں :۔

''یعنی نشانیوں کے نہ دیکھنے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کے دکھانے پر قادر نہیں ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ان طریقوں سے کام لینا اللہ کی مصلحت کے خلاف ہے اس لئے کہ اصل مقصود تو ہدایت ہے نہ کہ ایک نبی کی نبوت منوا لینا اور ہدایت کے بغیر ممکن نہیں کہ لوگوں کی فکر و بصیرت کی اصلاح ہو۔'' (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۲۶۰)

اس کے ساتھ یہ بات اور سمجھ لینی چاہیئے کہ یہ جو اللہ تعالےٰ دشمنانِ حق کی مخالفانہ کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی مشیت کا بار بار حوالہ دیتا ہے اس سے مقصود دراصل نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے ذریعہ اہل ایمان کو یہ سمجھانا ہے ۔۔۔۔۔۔ کہ تمہارا کام شریروں اور باغیوں کے مقابلہ میں اللہ کے پسند کردہ طریقہ کو غالب کرنے کے لئے جد وجہد کرنا ہے ۔۔۔ تمہیں باطل پرستوں کے مقابلہ میں سخت کشمکش اور جد وجہد کرکے اپنی حق پرستی کا ثبوت دینا ہوگا۔ ورنہ معجزوں کے زور سے باطل کو مٹانا اور حق کو غالب کرنا ہوتا تو تمہاری ضرورت ہی کیا تھی۔''

(تفسیر تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۵۷۴)

اب مندرجہ ذیل تحریرات کو دوبارہ پڑھ لیجئے۔ ان میں یہی تو کہا گیا ہے ناکہ :۔

(ا) معجزات۔ خارق عادت کا ظہور ہوتا ہے۔

(ب) جو ان سے انکاری ہیں انہیں قرآن ہی کا انکار کر دینا چاہیئے۔

(ج) جو ان کی تاویل میں انہیں عام قوانین الٰہی کے تحت صادر ہونے والے عام واقعات بتانے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھونڈی سخن سازی کے مرتکب ہیں۔ لیکن

(د) معجزہ نمائی کی ہماری اسکیم میں کوئی جگہ نہیں

(ہ) اللہ تعالےٰ اپنی قدرت قاہرہ کو مدنیت صالحہ کی تعمیر کی تائید میں نہیں لاتا کیونکہ یہ اللہ کی

حکمت کے خلاف ہے۔

(ن) وہ نشانیاں نہیں دکھاتے کیونکہ ان طریقوں سے کام لینا ان کی مصلحت کے خلاف ہے۔

ایک طرف

(ص) معجزہ دراصل نبیوں کو فرستادۂ رب العلمین ثابت کرنے کی رب العلمین کی طرف سے براہ راست مداخلت تھی۔

لیکن دوسری طرف

(ل) اللہ تعالیٰ نشانیاں اسی لئے نہیں دکھاتے کہ اصل مقصود تو ہدایت ہے نہ کہ نبی کی نبوت منوانا

اب ان میں سے کونسی حیثیت درست ہے وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ مودودی صاحب کا ان لوگوں کے بارے میں دیا گیا یہ فیصلہ جو نشانات کو قوانین فطرت کے تحت صادر ہونے والے عام واقعات دکھانے کی کوشش کرتے ہیں ان لوگوں کی نیک نیتی اور مسلمان کہلانے پر اصرار کے مقابل سخت زیادتی ہے جب تک ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہ ہو کہ ایسا ماننے والے محض آبائی عصبیت کے سبب اس کتاب کو مانتے چلے جا رہے ہیں یا دل و دماغ سے غور کرنے کے بعد بھی وہ اس کتاب کے قائل ہیں۔ ہمارا ان کو آبائی عصبیت پر متہم کرنا خود ہمارے بارے میں شکوک و شبہات کو پیدا کر سکتا ہے۔ آخر مودودی صاحب بھی تو خوارق کے وجود کو محض اعتقاداً ہی مان رہے ہیں ورنہ انہوں نے خود نہ تو کوئی خوارق عادت بات ہوتی دیکھی ہے اور نہ ہی ان سے کوئی خارق عادت بات ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اگر کوئی یہ کہدے کہ مودودی صاحب نے بھی تو ایمان اپنے آبائی مذہب کے باعث ہی خوارق پر لایا ہے تو مودودی صاحب کے پاس اس سے انکار کا کیا ثبوت ہوگا یہی نا کہ میں نے اس بات میں اپنی عقل کی روشنی سے معلوم کیا ہے کہ خارق عادت واقعات کا ہونا بعید از امکان نہیں۔

اگر یہی جواب ہے تو اس شخص کا جواب کیوں درست نہیں جو کہتا ہے کہ جس کو تم خارق عادت کہتے ہو میں اسے قوانین فطرت کے تحت ہونے والا واقعہ بتا سکتا ہوں۔ اب دونوں کا خارق عادت واقعہ کے وقوع سے استنباط اگر اسلام ہی کی حقانیت کو ثابت کرنا ہے تو پھر ایک کا عمل ممدوح اور دوسرے کا مذموم کیوں قرار دیا جائے پھر ایک کو کیوں کہا جائے کہ وہ بھونڈی سخن سازی

کا مرتکب ہے؟ جہاں تک ہمیں گمان ہے کہ مودودی صاحب اب خارق عادت کے ظہور کے قائل نہیں۔ کیونکہ وہ انہیں صرف انبیاء کے لیئے ایک خصوصی امتیاز قرار دیتے ہیں اور نبوت اب بند ہو چکی ہے کہیئے کیا ایسی حالت میں آپ کا کسی دوسرے مسلمان کو خارق عادت کی تمام تشریح کرنے پر مطعون کرنا کہاں تک بجا ہے جب کہ آپ کا اپنا ایمان بھی خارق عادت پر محض سماعی اور قیاسی ہے نہ کہ عینی اور ذاتی۔

مودودی صاحب کے طرز استدلال کا ایک اور افسوسناک پہلو بھی ہے وہ اصرار کرتے ہیں کہ قرآن پاک کو ماننے والا مسلمان صرف اسی طور پر اس کے ترجمہ اور تفسیر کو قبول کرے جس طور سے اسے مودودی صاحب نے سمجھا ہے۔ اور اگر وہ اس کا کوئی اور مفہوم اپنی سمجھ کے تحت لے تو اس کے اسلام میں ہی شک ہے۔ یہ انتہاپسندانہ جبریت جس کے دوسروں کو اپنے ہی نکتہ نظر قبول کرنے پر مجبور کرنا یا اسے سرے سے ہی اس گروہ سے نکال پھینکنا جس کا فرد ہونے پر اسے اصرار ہو ہمارے لیئے ناقابل قبول ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اس قسم کا انتہائپسندانہ رویہ عموماً انہی لوگوں سے انہی لوگوں کے بارے میں صادر ہوتا ہے جو خود کو اسلام کا ترجمان کہتے ہیں اور جو اسلام پر عامل بھی ہوتے ہیں اور شدت سے اس کا منجانب اللہ ہونا بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چاہے ان کے ایمان کی بنیاد عقلیت ہو یا روایت پسندی۔ بہرحال ان میں سے کسی کو اسلام سے باہر دھکیلنے کا یہ عجیب طریق تحکم کسی بھی اچھے مسلمان کو نہ صرف مرغوب ہو سکتا ہے نہ زیب دیتا ہے۔

ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ اللہ تعالے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ ان کی سلطنت ہے جس کے وہ حاکم کل ہیں۔ جب وہ اتنے بڑے نظام کو عدم سے وجود میں لائے ہیں جس کی وسعت کی حد معلوم نہیں تو کیا وہ خارق عادت واقعات نہیں دکھا سکتے؟

ضرور دکھا سکتے ہیں۔ ہم معجزات اور کرامات کے قائل ہیں۔ لیکن ہمیں اختلاف اس بات سے ہے کہ مودودی صاحب قوانین فطرت کے حوالے سے معجزات کی تشریح کو ناجائز کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ خود اللہ تعالے نے قوانین فطرت کی طرف بار بار انسان کی توجہ دلائی ہے اور اسے اس کی عظمت اور اس میں پنہاں تحیر کا احساس دلایا ہے؟ بات یہ ہے کہ انسان روزمرہ کی

زندگی کے چلن سے ایسا عادی ہو چکا ہے کہ اسے اس میں کوئی خاص بات تحیّر انگیز محسوس نہیں ہوتی اسے اس کائنات کے ازلی ابدی ہونے کا یقین سا ہو گیا ہے وہ اس کو حقیقت اور غیب کو واہمہ سمجھتا ہے وہ اگر خدا کا بھی قائل ہوا تو مادہ کے ازلی ابدی اور روحوں کی افادیت کو بھی تسلیم کرنے لگا۔ یوں ایک ان کہی تثلیث نے اس کے ذہن میں پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ یہ حقیقت جو ہمیں ظاہر نظر آتی ہے اللہ تعالےٰ نے اس کی طرف انسانوں کی توجہ شدّ و مدّ سے دلائی ہے۔ اور بار بار کہا ہے کہ اگر غور کرو تو سب سے عجیب شئے تو یہ کائنات ہے۔ کیا یہ کسی معجزہ سے کم ہے؟ کیا کائنات کو اللہ تعالےٰ کے سوا کسی اور نے بنایا ہے کہ انسان اس عادی صورت حال میں کسی غیر عادی مداخلت کے ہونے سے ہی اللہ تعالےٰ کی ہستی یا اس کے فرستادوں کی صداقت کا قائل ہو سکے؟

قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے بارے میں بعض واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے بعض انبیاء کے بعض اہم کارناموں ہی کا یا ان کی زندگیوں کے بعض ہی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ خود کتاب اللہ نے بعض واقعات کو قصص کہہ کر بیان کیا ہے۔ مودودی صاحب نے قرآن پاک کے اس طریق تخاطب کی تشریح میں لکھا ہے۔

”جو لوگ قرآن کے انداز بیان سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے وہ بسا اوقات اس شبہ میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ سارا معاملہ بس ایک دو صحبتوں میں ختم ہو گیا ہوگا۔ نبی اٹھا اور اس نے اپنا دعوےٰ پیش کیا۔ لوگوں نے اعتراضات کیئے اور نبی نے ان کا جواب دیا لوگوں نے جھٹلایا اور اللہ نے عذاب بھیج دیا۔ حالانکہ فی الحقیقت جن واقعات کو یہاں سمیٹ کر چند سطروں میں بیان کر دیا گیا ہے وہ ایک نہایت طویل مدت میں پیش آئے تھے۔

”قرآن کا یہ مخصوص طرز بیان ہے کہ وہ قصہ گوئی محض قصہ گوئی کی خاطر نہیں کرتا بلکہ سبق آموزی کے لیئے کرتا ہے اس لیئے ہر جگہ تاریخی واقعات کے بیان میں وہ قصے کے صرف ان اجزا کو پیش کرتا ہے جو اس کے مقصد و مدّعا سے کوئی تعلق رکھتے ہیں باقی تمام تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ پھر اگر کسی قصہ کو مختلف مواقع پر مختلف اغراض کے لیئے بیان کرتا ہے تو ہر جگہ مقصد کی مناسبت سے تفصیلات بھی مختلف طور پر پیش کرتا ہے“ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۳-۴۲)

یہی نہیں بلکہ بعض جگہوں پر دلائل میں بھی تفصیل میں جانا ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ درمیانی حصص کو ترک کر کے انہیں سامع کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مثلاً بعث بعد الموت کے بارے میں سورۃ السجدہ میں اللہ تعالٰی نے لوگوں کا اعتراض نقل کیا ہے کہ وقالوا ءاذا ضللنا فی الارض ءانا لفی خلق جدید ط بل ھم بلقاءی ربھم کٰفرون۔ مودودی صاحب نے اس پر حاشیہ لکھا ہے:۔

"اوپر کے فقرے اور اس فقرے کے درمیان پوری ایک داستان کی داستان ہے جسے سامع کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا ہے۔" (تفہیم القرآن جلد چہارم ص۲۲)

اسی طرح قرآن پاک کی زبان میں بھی بعض باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ وہ لفظ محض لغوی طور پر استعمال ہو جو دوسری جگہ اصطلاحاً آجائے اور پھر اصطلاحاً بھی ایک عمومی اصطلاح ہو سکتی ہے جو تمام لوگوں میں مروج ہو یا پھر قرآن پاک نے خود اس اصطلاح کو وضع کیا ہو اور وہ ان خاص معنوں میں مستعمل ہو رہی ہو اس لئے وہاں اسے لغوی معنوں میں لینا یقیناً اس مفہوم کی ترجمانی نہیں ہو گی جو کہ قرآن کا مقصود ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآن اگرچہ عربی مبین میں نازل ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی ایک مخصوص اصطلاحی زبان بھی رکھتا ہے اس نے بکثرت الفاظ کو ان کے اصل لغوی معنی سے ہٹا کر ایک خاص معنی میں استعمال کیا ہے اور بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کو وہ مختلف مواقع پر مختلف مفہومات میں استعمال کرتا ہے۔ پابندیٔ لفظ کے ساتھ جو ترجمے کئے جاتے ہیں ان میں اس اصطلاحی زبان کی رعایت ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہے۔ اور اس کے ملحوظ نہ رہنے سے بسا اوقات ناظرین طرح طرح کی الجھنوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔" (تفہیم القرآن جلد اول ص۱)

لیکن ہمیں ایسا محسوس ہوا ہے کہ خود مودودی صاحب نے بھی اوپر بیان کردہ اصولوں کو بعض جگہوں پر ملحوظ نہیں رکھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان لوگوں کے لئے بہت سخت لفظ استعمال کئے ہیں جو مودودی صاحب کی ان مقام پر اختیار کردہ تشریح یا تفسیر سے اختلاف کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی اساس اختلاف کچھ اسی نوعیت کی ہے جس کا عدد وار بعہ خود مودودی صاحب نے اوپر بیان کر دیا ہے۔

ہم نے مودودی صاحب کے بیان کردہ اصول اس لئے اوپر درج کر دیئے ہیں کہ جب ہم متعلقہ مقامات پر ان اصولوں کی روشنی میں مودودی صاحب کی اپنی تشریحات کا موازنہ کریں تو بات صاف ہو سکے۔

قرآن پاک کے مخاطبوں میں ایک بہت اہم گروہ عیسائیوں کا بھی ہے اور قرآن پاک ان کے مسلک کو تفصیلاً زیرِ بحث لایا ہے۔ مستشرقین یورپ اور مسیحی منادوں نے اس بحث کو سمجھنے کی بجائے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن پاک نعوذ باللہ یہودیوں اور عیسائیوں کی روایات سے اخذ کرکے خود محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف ہے اور اس کا ماخذ وحی الہٰی نہیں اس الزام کو ان اسرائیلی کہانیوں نے بہت تقویت دی جو ہمارے مفسرین نے بدقسمتی سے اپنی تفسیروں میں نقل کر دیں۔ ان کہانیوں نے متن قرآن کے معانی کو ہمارے مفسروں اور مترجموں کے لئے ان کہانیوں کا پابند کر دیا۔ حالانکہ ان کہانیوں کی صحت کو متنِ قرآن کریم کی روشنی میں جانچا جانا چاہیئے تھا۔ نہ کہ متن قرآن کے معانی ہی ان کہانیوں کی رعایت سے کئے جاتے اپنی عددی قوت اور وسعت تبلیغ و تاثیر کے باعث عیسائی اور عیسائیت یقیناً وہ طاقت ہیں جن کے مسلک کا تجزیہ کرنا اسلام کے لئے ضروری تھا۔ اور اس تجزیئے میں حضرت مسیح علیہ السّلام مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت کو جس طور پر دیومالائی اور مافوق الفطرت یا بالائے عقل بنا دیا گیا ہے وہ عیسائیت کی بنیادی ضروریات کا عین تقاضا تھا۔ آدم کا گناہ کرنا اور اولادِ آدم کا اس گناہ کے سبب موروثی اور پیدائشی گنہگار ٹھہرنا اس بات کا متقاضی تھا کہ اولادِ آدم کا نجات دہندہ آدم کی اولاد نہ ہو تاکہ وہ اس وراثت کو پیدائشی طور پر حاصل نہ کرے جو آدم کے نطفے سے ہر فرزند آدم کا مقدر رہے۔ مسیحیت نے جب اولادِ آدم کو پیدائشی اور موروثی گنہگار ٹھہرایا تو مسیح کو اس وراثت سے پاک رکھنے کے لئے آدم کی نسل سے ہٹا کر نعوذ باللہ اللہ تعالےٰ کا اکلوتا بیٹا بنا دیا۔ جو تولید و تناسل کے قانون کو توڑ کر کنواری عورت سے بغیر باپ کے پیدا ہوا۔ یوں آدم کا گناہ مسیح میں منتقل نہ ہو سکا۔ اور اولادِ آدم کو گناہوں اور دکھوں سے بچانے کے لئے اسے نعوذ باللہ خدائی اختیارات سونپے کیونکہ آدم کی اولاد تو گنہگار تھی وہ با اختیار کیسے ہوتی۔ مٹی کے پرندے بنا کر ان میں روح ڈالنا۔ مردہ انسانوں کو دوبارہ زندگی دینا۔ اندھوں، کوڑھیوں اور اپاہجوں کو چشم زدن میں آنکھوں

والا، پاک صاف، اور خود کار کر دینا یہی نہیں بلکہ خود بھی موت کے منہ سے نکل کر گذشتہ تقریباً دو ہزار سال سے اسی جسم کے ساتھ زندہ آسمانوں پر موجود ہونا۔ سب اس کے مخصوص امتیازات گردانے گئے جو کسی دوسرے انسان کو آج تک نہیں ملے۔ یہ ابدی زندگی جو اسی جسم کے ساتھ مسیح کو حاصل ہوئی اس میں مسیح کا صلیب پانے والا واقعہ ایسا نہ تھا۔ جسے تاریخی طور پر جھٹلایا جا سکتا ہے۔ اور یہودیوں کے نزدیک کسی مدعیٔ رسالت و نبوت کا کاٹھ پر لٹکایا جانا اور اس پر جان دے دینا اس کے کاذب ہونے کا ثبوت تھا کیونکہ انہوں نے اپنی کتابوں میں یہی پڑھا تھا:۔

"وہ جو پھانسی دیا جاتا ہے خدا کا ملعون ہے"۔ (استثناء ۲۱: ۲۱)

اور خود عیسائیوں نے بھی پرانے صحیفوں سے یہی کچھ سمجھا تھا:۔

"کیونکہ لکھا ہے جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے"۔ (گلیتون ۔ ۳: ۱۳)

اس لئے مسیحی معتقدات میں پہلے مسیح کو پاک ٹھہرایا گیا اور دیگر تمام ابنائے آدم کو پیدائشی طور پر گنہگار سمجھا گیا جس میں نعوذ باللہ تمام انبیاءؑ بھی شریک تھے۔ عدل اور رحم کے باہمی ٹکراؤ سے بچنے کے لئے خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے مسیح کو جو بے گناہ تھا عدل کی بھینٹ چڑھا دیا اور یوں مسیحی معتقدات کے تحت آدمؑ اور اولادِ آدم کے گناہوں کا بوجھ مسیح کے کندھوں پر ڈالا گیا تاکہ وہ نعوذ باللہ لعنتی موت مر کر انسانی گناہوں کی سزا پانے کے لئے جہنم میں جائے اور یوں اولادِ آدم کو اس سزا سے بچائے تا جو کوئی اس کے کفارہ پر ایمان لائے نجات پا جائے مسیح کے مصلوب ہونے کے بعد اسی جسم کے ساتھ دوبارہ زندگی کا دعوٰے بھی اسی مسیحی عقیدہ کی ضرورت تھی۔ اگر وہ دوبارہ مسیح کو اسی جسم کے ساتھ جی اٹھ کر اب تک زندہ تسلیم نہ کرتے تو یہودی معتقدات کے تحت مسیح نعوذ باللہ کاذب ٹھہرتے تھے کیونکہ وہ مصلوب ہوئے اور جان دے دی۔

اس طرح مسیح تمام انسانوں سے الگ ایک ایسا منفرد وجود بن گیا جو نوعِ انسانی پر نافذ تمام طبعی قوانین سے نہ صرف بالاتر ہو گیا بلکہ بادی النظر میں تو ان قوانین کی قوت متحرکہ یا نعوذ باللہ ان پر حاکم نظر آنے لگا۔ اب چند لمحے توقف کیجئے اور سوچئے کہ سب انسان تو طبعی قوانین سے پیدا ہوئے اور مسیح ان سے علاحدہ رکھے جائیں۔ تمام انسان تو ایک طبعی عمر پا کر کسی نہ کسی طریق پر فوت ہو جائیں اور مسیح دو ہزار

سال سے زندہ موجود ہوں ۔ تمام انسان تو مل کر بھی کسی پرندیا مخلوق کے پتلے میں جان نہ ڈال سکیں اور مسیح پرند بنا کر ان میں جان ڈال دیں ۔ کیا یہ سب باتیں مسیح کو ایک ایسی ہستی نہیں بنا دیتیں جو انسانوں سے یقیناً مختلف ہے ۔ اب اگر عیسائیوں نے مسیح کو خدا اور خدا کا بیٹا بنا دیا تو ان کے پاس ایسا باور کرنے کے وجوہ ظاہراً موجود ہوں گے ۔ سورۃ العمران میں حضرت مسیح علیہ السّلام کا ذکر ہے مودودی صاحب لکھتے ہیں :۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیئے کہ قرآن کی یہ پوری تقریر دراصل عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید و اصلاح کے لئے ہے ۔ اور عیسائیوں میں اس عقیدہ کے پیدا ہونے کے اہم ترین اسباب تین تھے ۔

(۱) حضرت مسیح کی اعجازی ولادت

(۲) ان کے صریح محسوس ہونے والے معجزات

(۳) ان کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا جس کا ذکر صاف الفاظ میں ان کتابوں میں پایا جاتا ہے ۔"

(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۲۵۷)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ مقصود جس کی نشاندہی مودودی صاحب نے عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیت کی تردید و اصلاح کے عنوان سے کی ہے ان تمام باتوں کو جو عیسائیوں کے معتقدات میں علیٰ حالہٖ مان لینے سے حاصل ہو جاتا ہے ؟ ہمارا خیال ہے کہ ایسا ممکن نہیں ۔ اس کا ثبوت گذشتہ کم از کم ایک ہزار سال سے کروڑوں انسانوں کا الوہیت مسیح پر ایمان لانا ہے ۔ الوہیت جسے وہ انہی وجوہ کی بنا پر مسیح میں متحقق سمجھتے آرہے ہیں جن وجوہ کو مودودی صاحب نے مختصراً لیکن نہایت جامع طور پر بیان کیا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ کہا جائے آخر کروڑوں مسلمان بھی تو مسیح کے ان اعجازوں کے باوجود انہیں انسان ہی سمجھتے ہیں ۔ تو گذارش ہے کہ اس سے مسیحیوں کے غلط استنباط کی تردید تو نہیں ہوتی ۔ کیا قرآن پاک نے مودودی صاحب کے خیال میں ان وجوہ کی جو الوہیت مسیح کے عقیدہ کے تین اہم اسباب میں کوئی ایسی توجیہہ بیان کی ہے جو عیسائیوں کے ان معتقدات کی تردید و اصلاح کرتی ہو ۔ مودودی صاحب کا کہنا ہے :۔

قرآن نے پہلے بات کی تصدیق کی اور فرمایا مسیح کا بے باپ پیدا ہونا محض اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا۔۔۔۔ دوسری بات کی بھی قرآن نے تصدیق کی خود مسیح کے معجزات ایک ایک کرکے گنوائے مگر بتا دیا کہ یہ سارے کام اس نے اللہ کے اذن سے کئے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اب تیسری بات کے متعلق اگر عیسائیوں کی روایت سرے سے بالکل ہی غلط ہوتی تب تو ان کے عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید کے لئے ضروری تھا کہ صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ جسے تم اللہ اور ابن اللہ بنا رہے ہو وہ مر کر مٹی میں مل چکا ہے۔۔۔۔۔لیکن ایسا کرنے کے بجائے قرآن۔۔۔۔ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو زندہ اٹھائے جانے کے مفہوم کا کم از کم احتمال تو رکھتے ہیں۔(ایضاً ص ۲۵۸)

یعنی وہ تینوں باتیں جن پر الوہیت مسیح کے عقیدہ کی بنیاد ہے مودودی صاحب کے نزدیک واقعتہً تو درست ہیں البتہ ان سے وہ مفہوم لینا جو الوہیت مسیح کا عقیدہ بن دے غلط ہے۔کیوں؟ اس لئے کہ:۔

(۱) بے باپ پیدا ہونا محض اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے۔اللہ جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے"

(۲) کہ یہ سارے کام (یعنی معجزات۔ناقل) اس نے اللہ کے اذن سے کئے تھے بااختیار خود بھی نہیں کیا"

اور دسرا "کہ مسیح سرے سے صلیب چڑھائے ہی نہیں گئے یعنی وہ جس نے آخری وقت میں ایلی ایلی لما سبقتانی کہا تھا اور وہ جس کی صلیب پر چڑھی ہوئی تصویر تم لئے پھرتے ہو وہ مسیح نہ تھا"(ایضاً صفحہ ۲۵۸)

اس بات سے قطع نظر کہ کیا واقعی قرآن پاک نے یہی کہا کہ جو مودودی صاحب بیان کر رہے ہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ توضیحات الوہیت مسیح کے عقیدہ کی کس طرح تردید یا اصلاح کرتی ہیں کیونکہ مودودی صاحب مانتے ہیں:۔

"یہ پوری تقریر دراصل عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید و اصلاح کے لئے ہے"
(ایضاً صفحہ ۲۵۷)

پہلا جواب کہ اسے محض اللہ کی قدرت کا کرشمہ قرار دیا جائے اگر درست بھی مان لیا جائے

تو بات یہیں تو ختم نہیں ہو جاتی۔ عیسائیوں نے حضرت عیسےٰ کو اللہ اور ابن اللہ اسی وجہ سے سمجھا تھا کہ ان کی پیدائش غیر فطری طور پر بغیر باپ کے ہوئی تھی؟ سوال یہ ہے کہ آخر اللہ تعالےٰ نے مسیح کو بن باپ پیدا کیوں کیا اور وہ اصل الاصول کیوں توڑا جس سے سید الانبیا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی مستثنےٰ نہیں کیا؟ اس میں کوئی تو مصلحت خداوندی ہوگی۔ وہ مصلحت مسیحی عقیدہ نے موروثی گنہگاروں کی قطار سے گنہگاروں کے منجی کو الگ اور پاک رکھنے کی صورت میں پہچان لی۔ اگر کہا جائے کہ آخر آدم کو بھی تو ماں باپ کے بغیر پیدا کیا تھا تو غرض ہے کہ وہاں تو تخلیق کا آغاز تھا۔ مسیح سے تو کوئی تخلیق جدید شروع نہ ہو رہی تھی۔ ہاں اگر حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم بغیر باپ کے ہوتے تو بات کسی حد تک سمجھ میں آسکتی تھی کہ خاتم الانبیا پر ایک ایسا معجزہ دکھا کر نبوت کو ختم کیا گیا لیکن مسیح میں تو کوئی ایسی بات بھی نہ تھی۔ اللہ تعالےٰ کا کوئی کام بے مقصد نہیں۔ مودودی صاحب کو چاہیئے تھا کہ حضرت مسیح کے بن باپ پیدا ہونے کی مصلحت بھی بیان کر دیتے محض کرشمۂ قدرت الٰہی کہہ دینا کافی نہیں کیونکہ جس بات کو آپ محض کرشمہ قدرت الٰہی کہہ رہے ہیں۔ اس پر ایک عظیم مشرکانہ عقیدے کی عمارت اٹھائی گئی ہے۔ اور آپ خود مانتے ہیں کہ یہاں در اصل اسی مشرکانہ عقیدے کی نفی کی خاطر یہ سب کچھ کہا گیا ہے۔ بات صرف پیدائش تک محدود نہیں بلکہ آدم کے گنہگار ہونے اور اولاد آدم کے نسلاً بعد نسلٍ اس گناہ کے داغ کو پیدائشی طور پر مرد کے ذریعے پلنے اور سبوط نسل انسانی اور اس ہبوط سے نجات پانے تک ممتد ہے۔ آپ نے دیکھا کہ معاملہ صرف پیدائشی اعجاز کا نہیں بلکہ اس سے پیدا ہونے والے عقیدہ کا ہے۔ اور دونوں کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔

رہا دوسرا جواب تو اس میں بھی مسیحی عقیدہ، جناب مسیحؑ کے اختیارات باپ سے اس مخصوص رشتے کی بنا پر ماخوذ مانتا ہے جو باپ اور بیٹے کو باہم مربوط کرتا ہے۔ یہ باپ ہی تو ہے جس نے بیٹے کو اختیار دیا ہے۔ عقیدہ ابن اللہ ہونے کا ہے اور اس ابنیت کے سبب اسے ان اختیارات کے استعمال کا حق بخشا گیا ہے جس سے دوسری نوع انسانی کو جو مخلوق ہے اور خدا تعالےٰ کے ساتھ شریکِ اختیار نہیں ہو سکتی باز رکھا گیا ہے۔ اب آپ کی توضیح کہ مسیح کے مخصوص معجزات مسیح کے اپنے اختیار سے نہیں بلکہ باذن اللہ تھے۔ مسیح کے ابن اللہ ہونے کی کس طرح نفی کرتی ہے؟ کیا باپ کے تفویض کردہ اختیارات استعمال کرنے سے بیٹے کی ابنیت کی نفی ہو جاتی ہے؟ مسیحی عقیدہ تو یہی ہے کہ مسیح کے

اختیارات اسکے اس مخصوص رشتہ سے ماخوذ تھے جو اسے خدا تعالےٰ کا نعوذ باللہ اکلوتا بیٹا ہونے سے سبب حاصل تھے۔ یہاں بھی وہی الجھن ہمارا راستہ روکتی ہے جو پہلے جواب کی راہ میں حائل ہے کہ بالفرض ان اختیارات اور مخصوص معجزات کی تفویض اور صدور میں مصلحت الٰہی کیا تھی۔ اگر کہا جائے کہ نبوت مسیح کی تائید تو ایک بار پھر یاد رکھیئے کہ یہاں مودودی صاحب کو مسلّم ہے کہ قرآن پاک :۔

"عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید و اصلاح کے لئے" یہ سب کچھ بیان کر رہا ہے یعنی مقصود الوہیت مسیح کی نفی ہے نہ کہ نبوت مسیح کا اثبات۔ مخاطب مسیحی ہیں نا کہ یہود۔

اب رہا تیسرا جواب تو مودودی صاحب مانتے ہیں کہ جہاں تک نفسِ واقعہ کا تعلق ہے وہ ضرور پیش آیا تھا۔ ہر چند کہ :۔

"وہ جس نے آخری وقت میں ایلی ایلی لما سبقتانی کہا تھا اور وہ جس کی صلیب پر چڑھی ہوئی حالت کی تصویر تم لئے پھرتے ہو وہ مسیح نہ تھا"

یعنی یہ درست ہے کہ تاریخی طور پر ایک شخص کو آج سے تقریباً انیس سو سال قبل یروشلم میں یہودیوں کے اصرار پر رومیوں کی تصدیق سے صلیب ضرور دیا گیا تھا اور اس نے آخری وقت میں ایلی ایلی لما سبقتانی بھی کہا تھا لیکن وہ مسیح نہ تھا۔ لیکن یہ کہہ چکنے کے باوجود مودودی صاحب کو اس بیان کی کمزوری کا احساس ضرور ہوگا کیونکہ وہ لکھتے ہیں :۔

"تاہم ان (یعنی یہودیوں) ۔ ناقل) کا جرم اس سے کم نہیں ہوتا کیونکہ جس کو انہوں نے کانٹوں کا تاج پہنایا جس کے منہ پر تھوکا اور جسے ذلت کے ساتھ صلیب پر چڑھایا اس کو وہ عیسےٰ بن مریم ہی سمجھ رہے تھے" (ایضاً صفحہ ۴۱۹)

لیکن اس کا دوسرا رخ بھی ہے جو شاید نظروں سے اوجھل رہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن کو مجرم کہا جا رہا ہے ان کو تو اس بات کا علم ہی نہ ہو سکا کہ انہوں نے کوئی جرم کیا ہے وہ تو اپنے نزدیک عین ثواب کا کام کر رہے تھے اور دین کی حفاظت کا اہم فریضہ سر انجام دے رہے تھے۔

جس پر ان کے اعتقاد کی رو سے جرم کے ظاہراً پورے طور پر انجام پا جانے سے مہر تصدیق ثبت ہو رہی تھی کہ :۔

"وہ جو پھانسی دیا جاتا ہے خدا کا ملعون ہے" اور وہ جو ملعون ہو وہ نبی کیونکر ہو سکتا ہے۔

یہ تو یہودیوں کا معاملہ رہا۔ لیکن جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے اور جنہیں مودودی صاحب یہ کہہ کر حیرت میں ڈال دینا چاہتے ہیں کہ:۔

وہ جس کی صلیب پر چڑھی ہوئی حالت کی تصویر تم لئے پھرتے ہو وہ مسیح نہ تھا۔ مسیح کو تو اس سے پہلے ہی خدا نے اٹھا لیا تھا" کیا وہ بھی اس واقعہ کے عینی شاہد نہ تھے جس کا ذکر مودودی صاحب نے یہ کہہ کر کیا ہے:۔

"جس کو انہوں نے کانٹوں کا تاج پہنایا جس کے منہ پر تھوکا اور جسے ذلت کے ساتھ صلیب پر چڑھایا اس کو وہ عیسیٰ بن مریم ہی سمجھ رہے تھے"

اب نفس واقعہ کے دونوں گواہ ـــــ یہود اور مسیحی تو ایک ایسے شخص کے مصلوب ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ جو ان کے درمیان وجہ نزاع ہے۔ اور اسے مسیح ہی کہتے ہیں۔ نہ یہودیوں کو اس کا علم ہو سکا ہے کہ جسے صلیب دیا گیا وہ مسیح نہ تھا اور نہ عیسائیوں نے آج تک کہا کہ وہ شخص جس کو صلیب دیا گیا وہ مسیح کے سوا کوئی اور تھا۔ تو بعد میں محض یہ کہہ دینے سے کہ وہ جسے صلیب دیا گیا وہ مسیح نہ تھا مسیحی عقیدہ کی تردید کیسے ہو گئی؟ یہ دعوٰے تو محض دعوٰے ہے جس کی کوئی دلیل یا کوئی ثبوت بھی تو ہونا چاہیے اگر بالفرض محض اس دعوٰے سے مسیحی عقیدہ کی تردید ہو گئی تو ان چھ صدیوں میں گذر جانے والے مسیحیوں اور یہودیوں کا کیا قصور ہے جنہیں مودودی صاحب کا نکتۂ نظر حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل معلوم ہی نہ ہو سکا۔ اور وہ مسیح کے کفارے پر اس کی موت کے باعث ہی ایمان لاتے رہے:۔ "لیکن عیسائیوں نے ــــــــــــــــــــــ مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا ان کا عجیب و غریب نظریہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیح خدا کا مظہر اور اس کے کلمے اور اس کی روح کا جسدی ظہور ہے اس لئے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے اور خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو زمین پر اس لئے بھیجا کہ وہ انسانوں کے گناہ اپنے سر لے کر صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسان کے گناہ کا کفارہ ادا کرے" (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۲۹)

ہم مجبور ہیں کہ کہیں مودودی صاحب کی مندرجہ بالا توضیحات کے باوجود ہمارے لئے یہ بات

اب بھی غیر واضح ہے۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مودودی صاحب نے یہاں ان لوگوں کے لئے جو ایسی توضیحات کو غیر واضح اور مسئلہ متنازعہ فیہ میں مسیحی عقیدہ ہی کی تائید پر منتج ہوتا محسوس کرتے ہیں بہت ہی سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :۔

"جو لوگ قرآن کی آیات سے مسیح کی وفات کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ میاں کو صاف سلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب واضح کرنے کا سلیقہ نہیں۔ اعاذنا اللہ من ذالک،،
(ایضاً صفحہ ۲۵۸)

مودودی صاحب کی یہ بڑی زیادتی ہے وہ لوگ جو مسیح کی وفات قرآن پاک سے ثابت کرتے ہیں انہوں نے تو کبھی یہ جسارت نہیں کی کہ کہیں خدائے تعالےٰ کو صاف سلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب واضح کرنے کا سلیقہ نہیں۔ لیکن کیا خود مودودی صاحب نے اس حاشیہ سے چند سطر قبل خود ہی نہیں لکھا تھا کہ :۔

"قرآن ۔۔۔۔ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو زندہ اٹھائے جانے کے مفہوم کا کم از کم احتمال تو رکھتے ہیں،، (ایضاً صفحہ ۲۵۸)

کیا یہ بات کہ کم از کم احتمال تو رکھتے ہیں خود ایک ایسا بیان نہیں جو متذکرہ صدر آیت پر غیر واضح ہونے کا الزام دھرتا ہے اور دو مختلف احتمالات کی موجودگی کا اعلان کرتا ہے۔ کیا اللہ تعالےٰ کے کلام پر احتمالی اور غیر واضح ہونے کا الزام خود مودودی صاحب نہیں لگا رہے ؟ یہی نہیں خود اس سے قبل ایک اور بحث کے دوران وہ کیا قرآنی آیت فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ط کے بارے میں نہیں لکھ چکے :۔

"لیکن اس غرض کے لئے جو تدبیر بتائی گئی تھی یعنی لاش کو اس کے ایک حصے سے ضرب لگاؤ اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے" (ایضاً صفحہ ۱۱۱)

(خط کشیدہ الفاظ قرآنی آیت کا اردو ترجمہ یا مفہوم ہے) ابہام کا الزام اب کون کلام پاک کی آیت پر لگا رہا ہے اگر اب کوئی مودودی صاحب پر وہ الزام لوٹا دے جو انہوں نے قرآن پاک سے وفات مسیح کے قائلین پر لگایا ہے تو اس میں وہ غلط الزام لگانے والا نہ ہوگا کیونکہ مودودی صاحب ابہام کا خود ہی تو اقرار کر رہے ہیں :۔

نہ جانے مودودی صاحب نے یہ کہاں سے اخذ کر لیا کہ وفات مسیح کا مفہوم قرآن پاک سے

نکالنے کا مطلب گویا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ پر جسارت ہے کہ اسے صاف صاف بات کہنے کا سلیقہ نہیں اگر یہ نتیجہ نکالنا درست ہے تو چھ جلدوں میں لکھی جانے والی تفسیر تفہیم القرآن کس کلام کی وضاحت ہے کیا وہ کلام ان تفسیروں کے بغیر واضح نہ تھا۔ آپ متن قرآن پاک کا تفسیری حصے کی ضخامت سے موازنہ کر لیجیے، آخر اتنے لمبے چوڑے حواشی کسی متن کی وضاحت ہی تو ہیں۔ تو کیا اس کا مفہوم قرآن پاک کا نعوذ باللہ غیر واضح کلام ہونا ہوگا۔

قرآن پاک سے وفات مسیح پر استدلال کرنے والے تو سیدھی سادھی اور واضح عبارتیں پیش کرتے ہیں جن میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے متوفیک کہہ کر مسیح کو مخاطب کیا ہے اور دوسری جگہ مسیح کے منہ سے "توفیتنی" کہلوا کر اللہ تعالیٰ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ ہمیں تو یہ لفظ بڑے صاف نظر آتے ہیں جن کا بجز "میں تجھے وفات دینے والا ہوں" اور "جب تو نے مجھے وفات دی" اور کوئی ترجمہ کرنا خواہ مخواہ صاف لفظوں کو الجھانے کے سوا کچھ نہیں۔ لفظ مُتَوَفّی۔ مرجانے والے کے لئے اتنا معروف ہے کہ اس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ عدالتوں میں چلے جائیے وہاں مرجانے والے کا ذکر کرتے ہوئے بیانات میں فیصلوں میں جرح اور جواب جرح میں ہر جگہ لفظ متوفی استعمال کیا جاتا ہے قبرستانوں کے کتبے میں تاریخ وفات لکھی جاتی ہے اور اکثر کتبوں پر آپ لفظ "متوفی" تاریخ فلاں فلاں لکھا پائیں گے۔ اور اگر برا نہ منائیں تو مودودی صاحب کے انتقال پر ملال پر بھی اگر ان کے قبر پر بھی کوئی کتبہ ہوا تو اس پر "متوفی" ہی لکھا ہوا ہوگا ایک ایسا لفظ جو ان معنوں میں معروف ہے۔ اس کا کوئی اور ترجمہ سیاق و سباق سے کاٹ کر کرنا مترجم کے ذہن کا الجھاؤ ہو تو ہو، خدا تعالیٰ کے کلام میں کسی قسم کے ابہام کی دلالت نہیں کرتا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ توفی کے اصل معنی لینے اور وصول کرنے کے ہیں روح قبض کرنا اس لفظ کا مجازی استعمال ہے لیکن کیا مودودی صاحب نے جب کبھی کسی انسان کے قبض روح کے بارے میں عربی اور اردو کی کتب میں لفظ متوفی پڑھا ہے تو اس سے بجز وفات پانے کے کوئی اور مفہوم لیا ہے۔ پھر یہاں لغوی اور مجازی معنوں کی بحث کیوں پیدا کرتے ہیں ہمیں گمان غالب ہے کہ مودودی صاحب دل سے اس بات کو درست سمجھتے ہیں کہ توفی کے معنی حضرت عیسےٰ کی ضمن میں بھی وفات پانے کے ہی ہیں ورنہ ان کے قلم سے۔

"نہ زندہ اٹھائے جانے کے مفہوم کا کم از کم احتمال تو رکھتے ہیں"۔

کا جملہ نہ نکل سکتا تھا۔ اور وہ حتمی طور پر کہہ سکتے تھے کہ بجز زندہ آسمان پر اٹھانے کے یہاں کوئی دوسرا احتمال ہے ہی نہیں۔ لیکن ہمیں افسوس اس بات پر نہیں کہ وہ مسیح کو زندہ آسمان پر گزشتہ ایک ہزار نو سو چھتر سال سے کیوں تسلیم کرتے ہیں وہ ان کی مرضی ہے جو چاہیں کریں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ وفات مسیح ماننے والوں پر یہ تہمت کیوں دھر دی کہ وہ نعوذ باللہ قرآن پاک کو غیر واضح کلام سمجھ کر نعوذ باللہ خدائے عز و جل کو بات کرنے کا سلیقہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہیں وہ خود تو اس گستاخی کے مرتکب نہیں؟ کیوں کہ یہاں بجائے قرآن پاک سے وفات مسیح ثابت کرنے والوں سے الجھنے کے انہیں مسیحی عقیدہ سے بحث کرنا چاہیئے تھا جس کو کہ وہ یہاں قرآن کا مخاطب سمجھتے ہیں جو لوگ قرآن پاک سے وفات مسیح ثابت کرتے ہیں وہ تو بہر حال قرآن پاک کو تسلیم کرتے ہیں تبھی تو اسے بطور حجت پیش کرتے ہیں۔ مسیحی تو قرآن پاک کو مانتے نہیں۔

مودودی صاحب ان کے عقائد کی حمایت میں قرآن پاک کو پیش کر رہے ہیں وہ ان تینوں باتوں کو تقریباً اسی طرح درست تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ مسیحی معتقدات کی اساس کے طور پر حقائق ثابتہ کے انہیں پیش کیا جاتا ہے لیکن اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس سے وہ انکاری ہیں۔ یوں نتائج سے جان بوجھ کر آنکھ بند کر لینا اور بات ہے ورنہ جناب مسیح کی اعجازی پیدائش ماننا۔ انہیں ایام دنیا میں غیر معمولی فوق البشری ہی نہیں بلکہ نعوذ باللہ الٰہی اختیارات کا فعلاً حامل تسلیم کرنا۔ پھر ان کا جسم عنصری کے ساتھ زندہ آسمانوں پر چلے جانا اور وہاں آج تک اسی جسم کے ساتھ زندہ موجود ہونا۔ یہ امتیازات اگر درست ہیں تو عیسائیوں کا جناب مسیح کو خدا یا خدا کا حصہ مان لینا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔

اسی ضمن میں مودودی صاحب نے قرآن پاک کی آیت متعلقہ اہل یہود وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ (سورۃ النساء) پر بحث کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ کہ یہودی یہ جانتے ہوئے بھی کہ مسیح در اصل خدا تعالےٰ کے سچے رسول ہیں۔ ان کے مخالف ہوئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"یعنی جرأت مجرمانہ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے تھے اور پھر ان کے قتل کا اقدام

کیا اور فخریہ کہا کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے" (ایضاً صفحہ ۴۱۸)

گویا قرآن پاک نے یہودیوں کے ایک مثبت قول کو نقل کیا ہے۔ نہ کہ طنزیہ کو۔ لیکن یہ بات واقعی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اور مودودی صاحب نے بھی دو چار سطر اس کے بعد یہی کہا ہے۔

"بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ قوم کسی شخص کو نبی جانتے ہوئے اسے قتل کر دے مگر واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی قوموں کے انداز و اطوار ہوتے ہی کچھ عجیب ہیں" (ایضاً صفحہ ۴۱۸)

اس تشریح کے باوجود ہماری حیرت میں کمی نہیں ہوئی کہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ کو مانتا ہو۔ اور یہ بھی تسلیم کرے کہ اس کی طرف بلانے والا واقعی اس کا نبی اور رسول بھی ہے۔ پھر بھی نہ صرف اسے اس نبی کو تسلیم کرنے سے انکار ہو بلکہ وہ اس کے قتل کا اقدام بھی کر گذرے۔ حالانکہ بخوبی جانتا ہو کہ اس دنیا میں اسے ہمیشہ رہنا نہیں اور اس اَحۡکَمُ الۡحَاکِمِیۡن کے حضور جا کر اس جرم کا جواب بھی دینا ہوگا

ہمارا خیال یہی ہے کہ قولِ زیرِ بحث میں دراصل یہودیوں کی اس طنزیہ کو نقل کیا گیا ہے جو مسیح پر وہ کرتے تھے اور یہ کچھ یہودیوں سے ہی خاص نہیں۔ مثلاً حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں کا بھی یہی رویہ تھا سورۃ الحجر میں مودودی صاحب نے خود یہی مفہوم اس آیت "وَقَالُوۡا یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡ نُزِّلَ عَلَیۡہِ الذِّکۡرُ اِنَّکَ لَمَجۡنُوۡنٌ کا لیا ہے:۔ (۱۶ : ۶)

یہ فقرہ وہ لوگ طنز کے طور پر کہتے تھے۔ ان کو تو یہ تسلیم ہی نہیں تھا کہ یہ ذکر نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے نہ اسے تسلیم کر لینے کے بعد وہ آپ کو دیوانہ کہہ سکتے تھے دراصل ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ شخص جس کو دعویٰ یہ ہے کہ مجھ پر ذکر نازل ہوا ہے یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی فرعون نے حضرت موسیٰ کی دعوت سننے کے بعد اپنے درباریوں سے کہی تھی کہ اِنَّ رَسُوۡلَکُمُ الَّذِیۡۤ اُرۡسِلَ اِلَیۡکُمۡ لَمَجۡنُوۡنٌ ط یہ پیغمبر صاحب جو تم لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں ان کا دماغ درست نہیں"

(تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۹۶)

ایسے طنزیہ جملوں میں مخالف نبی کے پیروؤں پر دراصل ایک منفی پہلو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایسا شخص نبی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہودی جب کہتے تھے کہ ہم نے مسیح بن مریم کو قتل کر دیا تو مفہوم یہ تھا کہ وہ نبی کیونکر ہو سکتا ہے جسے بندے قتل کر دیں۔ لیکن مودودی صاحب نے اس جملے

کو مثبت بیان کے طور پر لیا ہے کہ ہاں وہ رسول اللہ ضرور تھے لیکن دیکھو ہم نے کس طرح ان کو بھی قتل کر دیا۔ یہ جرأت یہودیوں کی ہو یا نہ ہو کہ وہ ایسا جان بوجھ کر کہہ رہے ہوں۔ مودودی صاحب کی ذہنی کیفیت بعض مرتبہ ایسا ہی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ختم نبوت پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:۔

اب اگر بالفرض حال نبوت کا دروازہ کھلا بھی ہو اور کوئی نبی آ بھی جائے تو ہم بے خوف وخطر اس کا انکار کر دیں گے۔ خطرہ ہو سکتا ہے تو اللہ تعالےٰ کی بارگاہ پرس ہی کا تو ہو سکتا ہے وہ قیامت کے روز ہم سے پوچھے گا تو ہم یہ سارا ریکارڈ برسرِ عدالت لا کر رکھ دیں گے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ معاذ اللہ اس کفر کے خطرے میں تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہی نے ہمیں ڈالا تھا۔ ہمیں قطعاً کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس ریکارڈ کو دیکھ کر بھی ہمیں اللہ تعالےٰ کسی نئے نبی پر ایمان نہ لانے کی سزا دے ڈالے گا۔" (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۱۵۲-۱۵۱)

کتنی ہٹ دھرمی اور سینہ زوری ہے اگر سچ مچ نبی آ جائے۔ وہ خدا کی طرف سے ہو اور باب نبوت مسدود بھی نہ ہو تو کیا پھر بھی اس نبی کی نبوت کا انکار کوئی اسلامی شان ہے کیا فرماں برداری کے طریق ہیں۔ یہ عبارت دیکھ کر ہمیں ان یہودی علماء کا استدلال یاد آ گیا جس میں انہوں نے مسیح کو ماننے سے اس وجہ سے انکار کر دیا تھا کہ ملاکی نبی کی کتاب میں لکھا ہے کہ مسیح کے آنے سے پہلے ایلیا واپس آئے گا۔ اور چونکہ ایلیا واپس نہیں آیا۔ اس لئے تم مسیح نہیں ہو سکتے وہ بھی ایک ریکارڈ تھا اور مودودی صاحب کو بھی ریکارڈ کا بھروسہ ہے نہ یہودیوں نے حضرت عیسےٰ کی تشریح کو قبول کیا اور نہ مودودی صاحب کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تشریح تسلیم ہے ؎

" تا نہ ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو "

ظاہر ہے کہ اس طرزِ فکر میں خدا پرستی۔ رضائے باری تعالےٰ اور اس کے احکامات کی فرماں برداری مقصود نہیں ہو سکتی بلکہ محض ریکارڈ پرستی۔ آبائی عصبیت اور ہٹ دھرمی ہی صحیح دین داری تصور بن جاتے ہیں مودودی صاحب نے اس قسم کے طرزِ فکر کو شناخت بھی کیا ہے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کے ذکر میں سورۃ الشعراء کی آیت ۱۰۵ کَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ پر حاشیہ ۷۵ لکھا ہے:۔

اگرچہ انہوں نے ایک ہی رسول کو جھٹلایا تھا لیکن چونکہ رسول کی تکذیب درحقیقت اس دعوت

اور پیغام کی تکذیب ہے جسے لے کر وہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے آتا ہے اس لئے جو شخص یا گروہ کسی ایک رسول کا بھی انکار کر دے وہ اللہ تعالےٰ کی نگاہ میں تمام رسولوں کا منکر ہے یہ ایک بڑی اہم اصولی حقیقت ہے جسے قرآن میں جگہ جگہ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی کافر ٹھہرائے گئے ہیں جو صرف ایک نبی کا انکار کرتے ہیں باقی تمام انبیاؑ کو مانتے ہیں اس لئے کہ جو شخص اصل پیغام رسالت کو جاننے والا ہے وہ تو لازماً ہر رسول کو مانے گا مگر جو شخص کسی رسول کا انکار کرتا ہے وہ اگر دوسرے رسولوں کو مانتا بھی ہے تو کسی عصبیت یا تقلید آبائی کی بنا پر مانتا ہے نفس پیغام رسالت کو نہیں مانتا ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہی حق ایک پیش کرے تو یہ اسے مان لے اور وہی دوسرا پیش کرے تو یہ اس کا انکار کر دے"۔ (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۲۵۱)

اس بات کو ایک اور جگہ یوں بیان کرتے ہیں:۔

"دراصل جو بات ان آیات میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے آیا ہوا حقیقی دین مسیحیت یا موسویت یا محمدیت نہیں ہے بلکہ انبیاؑ اور کتب آسمانی کے ذریعے سے آئے ہوئے فرمان خداوندی کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا ہے اور یہ رویہ جہاں جس بندۂ خدا نے بھی جس زمانے میں اختیار کیا ہے وہ ایک ہی عالمگیر ازلی و ابدی دین حق کا متبع ہے۔ اس دین کو جن لوگوں نے ٹھیک ٹھیک اور اخلاص کے ساتھ اختیار کیا ہے ان کے لیے موسیٰ کے بعد مسیح اور مسیح کے بعد محمد صلے اللہ علیہ وسلم اجمعین کا ماننا تبدیل مذہب نہیں بلکہ حقیقی دین کے اتباع کا فطری و منطقی تقاضا ہے بخلاف اس کے جو لوگ انبیاؑ علیہم السلام کے گروہوں میں بے سوچے سمجھے گھس آئے یا پیدا ہو گئے اور قومی و نسلی اور گروہی تعصبات نے جن کے لئے اصل مذہب کی حیثیت اختیار کر لی وہ بس یہودی یا مسیحی بن کر رہ گئے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے آنے پر ان کی جہالت کی قلعی کھل گئی۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کے آخری نبی کا انکار کر کے نہ صرف یہ کہ آئندہ کے لئے مسلم رہنا قبول نہ کیا بلکہ اپنی اس حرکت سے یہ ثابت کر دیا کہ حقیقت میں وہ پہلے بھی "مسلم" نہ تھے محض ایک نبی یا بعض انبیاؑ کی گرویدگی میں مبتلا تھے یا آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کو دین بنائے بیٹھے تھے"۔ (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۶۴۹)

گویا یہ درست ہے کہ نبوت تامہ کاملہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی اور آپ کے بعد

کوئی نیا یا پرانا نبی نہیں آسکتا لیکن یہ عقیدہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد محض سماعی حیثیت اختیار کر لیتا اور عین ممکن تھا کہ نبوت کی حقیقت ہی مشتبہ اور ناقابل فہم بن جاتی اگر ہر صدی میں خدائے عزّ وجل مجدد دین کرام اور اس صدی میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو نہ بھیجتا اور ایک بار پھر وحی الٰہی سے اس بات کی توثیق نہ کر دیتا کہ نبوت حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر تمام ہو گئی۔

اس کے بعد ہمارے لئے محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعے حق تعالےٰ کا بھیجا ہوا دین بقول مودودی صاحب محمدیت نہ رہا اور حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہمارے لئے کسی نبی کی شخصی گرویدگی یا آباؤ اجداد کی اندھی تقلید نہ ہی بلکہ ہمارے لئے محمدیت اور اسلام ایک اور عین حقیقت اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہمارے لئے واجب الاتباع اسوہ حسنہ ٹھہری۔ کیونکہ ہم نے حقیقت محمدیہ کو حضور کے بعد بھی ہر دور میں جلوہ گر ہوتے ہوئے سنا اور قبول کیا اور اپنے دور میں جلوہ گر ہوتے ہوئے دیکھا اور پہچان لیا۔

اصل گفتگو سے یہ ضمنی انحراف صرف اس افسوس ناک روش کے بارے میں کچھ عرض کرنے کے لئے کیا گیا تھا جسے مودودی صاحب نے یہودیوں سے منقولہ قول اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ کے حوالہ سے یہودیوں میں متحقق ہونا بیان فرمادیا تھا اور بدقسمتی سے خود بھی ایک ایسے ہی طرز عمل کو اپنے لئے اختیار کرنے کا صریحًا اقرار کیا تھا اور اسی پر تمام امت کو بلا خوف وخطر چلنے کی تحریص دلوائی تھی۔ سوال ایک اصول کا ہے: بحث کسی شخصیت کے بارے میں نہیں۔ البتہ جہاں تک ختم نبوت اور بعثت مسیح موعود کا سوال ہے مودودی صاحب نے اس پر بھی روایتی روش ہی اختیار کی ہے اور شاید اس کے سوا ان کے لئے چارہ بھی نہیں تھا۔ لیکن بعض مقامات پر اگر وہ بہتر اور مہذب الفاظ اپنی تنقید میں استعمال فرماتے تو اچھا ہوتا۔

سورہ النساء کی آیت ۶۴۔ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ پر حاشیہ نمبر ۹۴ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

یعنی خدا کی طرف سے رسول اس لئے نہیں آتا کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ

لے کر آیا ہے تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اس کی پیروی کی جائے اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انہی پر عمل کیا جائے اگر کسی نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔" (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۳۶۸)

اب اس تشریح کی روشنی میں ان عبارتوں کو پڑھا جائے جو مسیح موعود کی بحث میں مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں لکھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں :-

"حضرت عیسےٰ ابن مریم علیہ السلام کا یہ دوبارہ نزول ۔۔۔۔۔ صرف ایک کار خاص کے لئے ۔۔۔ ہوگا کہ دجال کا استیصال کر دیں اس غرض کے لئے وہ ایسے طریقے سے نازل ہوں گے کہ جن مسلمانوں کے درمیان ان کا نزول ہوگا انہیں اس امر میں کوئی شک نہیں رہے گا کہ یہ عیسےٰ بن مریم ہی ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیوں کے مطابق ٹھیک وقت پر تشریف لائے ہیں۔ وہ آکر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں گے۔ جو بھی مسلمانوں کا امام اس وقت ہوگا اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے اور جو بھی اس وقت مسلمانوں کا امیر ہوگا اس کو آگے رکھیں گے تاکہ اس شبہ کی ادنےٰ سی بھی گنجائش نہ رہے کہ وہ اپنی سابق پیغمبرانہ حیثیت کی طرح اب پھر پیغمبری کے فرائض سرانجام دینے کے لئے واپس آئے ہیں ظاہر ہے کہ کسی جماعت میں اگر خدا کا پیغمبر موجود ہو تو نہ اس کا کوئی امام دوسرا شخص ہو سکتا ہے اور نہ امیر۔ پس جب وہ مسلمانوں کی جماعت میں آکر محض ایک فرد کی حیثیت سے شامل ہوں گے تو یہ گویا خود بخود اس امر کا اعلان ہوگا کہ وہ پیغمبر کی حیثیت سے تشریف نہیں لائے ہیں۔"

(تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۱۳)

ان تضادات اور مجبوریوں کو دیکھئے۔ کہاں وہ اعلان کہ رسول اس لئے نہیں آتا کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور اطاعت جس کی چاہو کرو۔ کہاں یہ تاویل کہ عیسٰی علیہ السلام تشریف لائیں گے۔ لیکن پیغمبرانہ حیثیت میں نہیں۔ پھر خود ہی مودودی صاحب نے آنے والے مسیح کو عیسٰی بن مریم کی بجائے مثیل مسیح کی آمد قرار دینے والوں کے ـ

اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے ہم یہاں پورے حوالوں کے ساتھ وہ مستند روایات نقل کئے دیتے ہیں جو اس مسئلے سے متعلق حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں پائی جاتی ہیں ان احادیث

کو دیکھ کر ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے کہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا اور آج اس کو کیا بتایا جا رہا ہے ۔" (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۱۵۴)

تمام حدیثیں نقل کیں۔ جن میں لکھا ہے کہ آنے والا مسیح "حاکم عادل بن کر" آئے گا دجال سے مسلمان لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے صفیں باندھ کر نماز کے لئے تکبیر اقامت کہی جا چکی ہوگی کہ عیسٰی بن مریم نازل ہو جائیں گے اور "نماز میں مسلمانوں کی امامت کریں گے" "وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے" "وہ چالیس سال تک زمین میں ایک امام عادل اور حاکم منصف کی حیثیت سے رہیں گے"

"یہ جملہ ۲۱ روایات ہیں۔ جو ۱۴ صحابیوں سے صحیح سندوں کے ساتھ حدیث کی معتبر کتابوں میں وارد ہوئی ہیں اگرچہ ان کے علاوہ دوسری بہت سی احادیث میں بھی یہ ذکر آیا ہے لیکن طول کلام سے بچنے کے لئے ہم نے ان سب کو نقل نہیں کیا بلکہ صرف وہ روایتیں لی ہیں۔ جو سند کے لحاظ سے قوی تر ہیں (ایضاً صفحہ ۱۶۲)

اس سے قطع نظر کہ انہوں نے بعض الفاظ کا ترجمہ کیا کر دیا ہے۔ ان کی منقولہ احادیث سے دو تین باتیں بڑی صاف طور پر اخذ ہوتی ہیں۔

(۱) آنے والا مسیح حکم۔ عدل بن کر آئے گا۔

(ب) بعض احادیث کی رو سے نماز میں مسلمانوں کی امامت کرائے گا۔

(ج) امت کے جن دو لشکروں کو دوزخ کی آگ سے محفوظ رہنے کی خوشخبری نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ان میں سے وہ دوسرا وہ (ہے) جو عیسٰی بن مریم کے ساتھ ہوگا۔"

لیکن خود ہی مودودی صاحب ان نقل کردہ احادیث کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "دوسری بات جو اتنی ہی وضاحت کے ساتھ ان احادیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت عیسٰی بن مریم علیہ السلام کا یہ دوبارہ نزول نبی مقرر ہو کر آنے والے شخص کی حیثیت سے نہیں ہوگا۔ نہ ان پر وحی نازل ہوگی نہ وہ خدا کی طرف سے کوئی نیا پیغام یا نئے احکام لائیں گے نہ وہ شریعت محمدی میں کوئی اضافہ یا کمی کریں گے۔ نہ ان کو تجدید دین کے لئے دنیا میں لایا جائے گا۔ نہ وہ آکر لوگوں کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دیں گے نہ وہ اپنے ماننے والوں کی ایک الگ امت بنائیں گے۔" (ایضاً صفحہ ۱۶۳)

سوال ہو سکتا ہے تو پھر وہ کس لئے آئیں گے؟ وہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے کہ "یہ دوبارہ نزول صرف ایک کار خاص کے لئے ہے"، اور اس کار خاص کی اہمیت کا اندازہ اس سے کر لیں کہ ان کے ساتھ مل کر جدّ و جہد کرنے والوں کو دوزخ کی آگ سے حفاظت کی خوشخبری حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے سنا دی ہے۔ ان مغالطوں سے قطع نظر جو "الگ امت" اور "اپنے پر ایمان لانے کی دعوت" وغیرہ کے الفاظ سے ذہن میں پیش آسکتے ہیں کیا کسی لشکر کا آنے والے مسیح کا ساتھ دینا خود جماعت سازی کو تسلیم نہیں کرتا؟ کیا مودودی صاحب نے یہ نہیں کہا کہ:-

"محض مسلمانوں کے درمیان ان کا نزول ہوگا انہیں اس امر میں کوئی شک نہیں رہے گا کہ یہ عیسیٰ بن مریم ہی ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیوں کے مطابق ٹھیک وقت پر تشریف لائے ہیں"

کیا اس بیان میں یہ احتمال ظاہر نہیں کہ ان مسلمانوں کے سوا دوسرے مسلمان بھی ہوں گے؟ تو کیا دوسرے مسلمانوں کو ان پہلے مسلمانوں کے ساتھ مل جانے کی دعوت نہیں دی جائے گی تاکہ سب مسلمان مل کر عیسیٰ بن مریم کے لشکر میں شریک ہو کر استیصال دجّال کے کار خیر میں شریک ہوں؟ آخر امت کیا ہوتی ہے؟ (ہم یہاں امت کا اصطلاحی اسلامی مفہوم نہیں لے رہے) ایک متبعین کی جماعت ہی تو ہے۔ اس کے قیام کو تو مودودی صاحب نے خود تسلیم کر لیا ہے جب کہ نزول ثانی پر مسلمانوں کے ایک ایسے گروہ کو عیسیٰ بن مریم کی معیت مل جائے گی جو ان کا ساتھ دے گا۔ کہا گیا ہے کہ ان کی تشریف آوری پیغمبرانہ نہ ہوگی۔ تو پھر ان کی حیثیت کیا ہوگی؟

"ان کی سابقہ نبوت پر تو آج بھی اگر کوئی ایمان نہ لائے تو کافر ہو جائے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم خود انکی اس نبوت پر ایمان رکھتے تھے۔ اور آپ کی ساری امت ابتدا سے ان کی مومن ہے یہی حیثیت اس وقت بھی ہوگی مسلمان کسی تازہ نبوت پر ایمان نہ لائیں گے بلکہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی سابقہ نبوت پر ہی ایمان رکھیں گے جس طرح آج بھی رکھتے ہیں"۔ (ایضاً صفحہ ۱۶۵)

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ایمان کیا چیز ہے؟ کیا وہی جسے مودودی صاحب نے "بس رسالت پر ایمان لے آؤ اور اطاعت جس کی چاہو کرو" کہہ کر خود ایک ایسی چیز قرار دیا تھا جس کی کوئی وقعت نہیں جب تک کہ اس رسول کی پیروی نہ کی جائے۔ اب اگر وہ پیغمبرانہ حیثیت سے نہیں آئیں گے تو انکی حیثیت

اور عام امتی کی حیثیت میں کیا فرق ہوگا :۔

مودودی صاحب نے علامہ آلوسی کی تفسیر روح المعانی کا اقتباس نقل کیا ہے جس میں علامہ موصوف نے لکھا ہے :۔

"عیسٰے علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو وہ اپنی سابق نبوت پر باقی ہوں گے بہر حال اس لئے معزول تو نہیں ہوجائیں گے مگر اپنی پچھلی شریعت کے پیرو نہ ہوں گے"

ظاھر ہے کہ مودودی صاحب نے علامہ آلوسی کو اپنی تائید ہی میں نقل کیا ہوگا۔ اب یہ منطق سمجھ سے باہر ہے کہ وہ

(ا) سابق نبوت پر بھی ہوں گے

(ب) اُس سے معزول تو نہیں ہو جائیں گے

لیکن ۔ (ج) پیغمبرانہ حیثیت میں تشریف نہیں لائیں گے

(د) اور ان کی (سابقہ) نبوت پر ایمان نہ لانے سے آدمی کافر بھی ہوجائے گا ۔

اور ان کی سابقہ نبوت (ا) معزول ہونے بغیر بھی سابقہ ہے ۔

(ب) اور معزول نہ ہونے کے سبب اب بھی ان میں ویسی ہی موجود ہے جیسی وہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے بھی موجود تھی ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل حضرت عیسٰے علیہ السلام میں ظاہر تھی اور اس کا انکار کفر بھی تھا اور اس کی طرف بلانے کے وہ مکلف بھی تھے لیکن اب وہ عیسٰی علیہ السلام میں موجود تو ہے لیکن وہ اس کی طرف کسی کو بلا بھی نہیں سکتے اور اگر ان کی آمد ثانی کے بعد پیدا ہونے والے لوگ اسے نہ بھی مانیں تو کافر بھی نہیں ہوتے اور قرآن پاک کی آیت وَمَا اَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ کی موجودگی میں بھی وہ مطاع نہیں رہے بلکہ مطیع اور امتی بن گئے مودودی صاحب کہتے ہیں :۔

"ان کا آنا بلاشبہ اس نوعیت کا ہوگا جیسے ایک صدر ریاست کے دور میں کوئی سابق صدر آئے اور وقت کے صدر کی ماتحتی میں مملکت کی خدمت انجام دے" (ایضاً صفحہ ۱۶۴)

جب وہ خود ہی اسے بلاتشبیہہ کہہ رہے ہیں پھر وہ دلیل میں ایک ایسی بات کیوں بیان کر رہے ہیں جو ان کے نزدیک اس نوعیت کی ہے ہی نہیں۔ جس کو وہ واضح کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مان لیجے کہ مثال درست ہے تو کیا وہ حضرت عیسےٰ کے نزول ثانی پر منطبق آتی ہے؟ نہیں۔ اس لئے کہ حضرت عیسےٰ کی شانِ نبوت تو بہرحال ان کے ساتھ ہوگی۔ سابق صدر والی مثال میں سابق صدر سے صدارت تو چھن چکی ہوتی ہے۔ وہ تو ایک عام شہری کی حیثیت میں خدمت انجام دیتا ہے اور حاکم صدر ہی صدر ہوتا ہے گویا شانِ صدارت ایک سے ختم ہو چکی ہوتی ہے اور دوسرے میں موجود ہوتی ہے۔ لیکن مودودی صاحب اور ان کی صف کے دوسرے اصحاب یہ مانتے ہیں کہ جو نبوت جناب عیسیٰ علیہ السّلام کو نبی بناتے وقت عطا ہوئی تھی وہ اب بھی اسی شان کے ساتھ ان کے پاس ہے ان سے یہ چھینی نہیں نہ انہیں اس سے معزول کیا گیا ہے نفسِ نبوت کے اعتبار سے ان میں اور حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں کوئی فرق نہیں۔ پھر کیا نزول ثانی کے بعد ہمیں بیک وقت دو نبیوں کی نبوت پر ساتھ ساتھ عمل کرنا ہوگا یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک نبی تو موجود نہیں جب کہ دوسرا ہمارے سامنے موجود ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ غائب نبی کا اتباع لازم ہے اور حاضر نبی کی نبوت بھی غیر موثر ہے۔ آپ خود ہی سوچیں یہ استدلال کس قدر مجبوریوں اور تضادات سے بھرا ہوا ہے۔

پھر یہ تو آج تک نہیں ہوا کہ کسی نبی کی نبوت پر اس کے تمام مخاطب لوگ فوراً اس کو خدا کا نبی پہچان کر ایمان لے آئے ہوں۔ مودودی صاحب کہتے ہیں کہ نزول ثانی میں مسئلہ کفر و اسلام پیدا نہیں ہوگا۔ کیونکہ مسیح کی نبوت سابقہ پر ایمان لانا تو آج بھی مسلمان ہونے کے لئے شرط ہے۔ لیکن سوال قابل غور تو نزول ثانی پر مسیح کو پہچاننا ہے مودودی صاحب بڑی سادگی سے یہ کہہ کر گذر جانا چاہتے ہیں کہ:۔

"وہ ایک ایسے طریقے سے نازل ہوں گے کہ جن مسلمانوں کے درمیان ان کا نزول ہوگا انہیں اس امر میں شک نہیں رہے گا کہ یہ عیسےٰ ابن مریم ہی ہیں"

لیکن یہاں انہوں نے جس انداز میں اس نزول کا ذکر کیا ہے اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ نزول ثانی کے وقت مسلمانوں کا ایک حصہ ہی ایسا ہوگا جن کے درمیان ان کا نزول ہوگا ان کی تعداد کا تعین مودودی صاحب نے نہیں کیا۔ اب چاہے وہ پچاسی فیصد مسلمان ہوں یا صرف ایک فیصد بہرحال پوری

ملّتِ اسلام تو نہیں ہوں گے۔ اگر بالفرض وہ مسلمان جن کے درمیان مسیح کا نزول نہیں ہوا ان کو پہچاننے سے انکار کر دیں اور پہلے مسلمانوں کی گواہی بھی تسلیم نہ کریں۔ تو مودودی صاحب نے ایسی صورت حال کا بھی کوئی حل سوچا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت حال میں معاملہ ایک سابق نبی کے مع اس کی نبوّت کے موجود ہو کر عقیدۃً اس کی سابقہ نبوّت کے اقرار لیکن واقعتاً اس کے روبرو اس کی پہچان اور اطاعت سے انکار کا بن جائے گا۔ اگر مسیح کے مخاطب اس کے نزول ثانی پر اس کو پہچان لیں گے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ اس کی سابق حیثیت کے بھی مؤید ہوں گے لیکن اگر وہ نزولِ ثانی پر اس کو پہچاننے سے انکار کر دیں تو وہ اس کی سابق حیثیت کے بھی مؤید نہیں رہیں گے کیونکہ ان کے سامنے وہ شخص اصالتاً موجود ہو گا جس کی نبوّت کا اقرار تو وہ زبان سے کرتے رہے لیکن اس کے آجانے پر اس کو پہچاننے سے ہی منکر ہو گئے۔ ایک ایسی صورت حال۔ چاہے افسوس ناک ہی سہی کا پیدا ہونا بعید از امکان نہیں۔ کیونکہ انبیاء کے ماننے سے انکار کرنے کی روش کی تاریخ بتاتی ہے کہ باوجود واضح نشانات اور معزز آیات کے کفار نے انہیں ہمیشہ سچا ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ خود مودودی صاحب اقراری ہیں کہ اگر باب نبوّت مسدود نہ بھی ہوا اور کوئی سچا نبی آ بھی جائے تو وہ اپنے ریکارڈ کی بناء پر اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے۔ نہ صرف یہی بلکہ انہوں نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے مسیح کو اللہ کا سچا رسول شناخت کیا پھر بھی فخریہ اسے صلیب دے کر کہا کہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ہو سکتا ہے کہ اسے صرف ایک قیاسی صورت حال قرار دیا جائے تو عرض ہے کہ تاریخ میں اس سے پہلے بھی بجنسہٖ ایسی بات ہو چکی ہے۔ جو مودودی صاحب نے لکھا ہے:۔

"حضرت یحیٰی اور عیسیٰ کی بعثت کے زمانے میں یہودی بالعموم تین آنے والوں کے منتظر تھے ایک حضرت الیاس اور دوسرے مسیح اور تیسرے وہ نبی (یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم) جب حضرت یحیٰی کی نبوّت شروع ہوئی اور انہوں نے لوگوں کو اصطباغ دینا شروع کیا تو یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں نے ان کے پاس جاکر پوچھا کیا تم مسیح ہو انہوں نے کہا نہیں پھر پوچھا کیا تم ایلیا ہو انہوں نے کہا نہیں پھر پوچھا کیا تم وہ نبی ہو انہوں نے کہا میں وہ بھی نہیں ہوں تب انہوں نے کہا اگر تم نہ مسیح ہو نہ ایلیاہ ہو نہ وہ نبی ہو تو پھر تم بپتسمہ کیوں دیتے ہو؟" (یوحنا ۱: ۱۹-۲۱)

پھر کچھ مدت بعد حضرت عیسٰی علیہ السّلام کا غلغلہ بلند ہوا تو یہودیوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ شاید ایلیا نبی آ گئے ہیں (مرقس ۶: ۱۴ - ۱۵) خود حضرت عیسٰی کے حواریوں میں بھی یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ ایلیا نبی آنے والے ہیں مگر حضرت نے یہ فرما کر ان کی غلط فہمی کو رفع فرمایا کہ "ایلیا تو آ چکا اور لوگوں نے اسے نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا" اس سے حواری پہچان گئے کہ دراصل آنے والے حضرت یحیٰی تھے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گذرے ہوئے حضرت الیاس (متی ۱۱: ۱۴ - اور متی ۱۷: ۱۰ - ۱۳) تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۳۰۶)

لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہودیوں نے نہ صرف حضرت یحیٰی کو الیاس کی آمد ثانی نہیں مانا بلکہ خود اس شخصیت کے درپے آزار ہوئے جس نے بقول مودودی صاحب اس غلط فہمی کو رفع کیا تھا کہ آنے والے سے مراد حضرت یحیٰی علیہ السّلام تھے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گذرے ہوئے حضرت الیاس ۔ لیکن خود مودودی صاحب نے مندرجہ بالا احادیث اور آنے والے مسیح کی پیش گوئی کو اس طرح کیوں نہیں سمجھا جیسا کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے حضرت الیاس کی آمد ثانی کی پیش گوئی کو سمجھا تھا ؟ :-

"جو شخص بھی ان احادیث کو پڑھے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ ان میں کسی مسیح موعود یا مثیل مسیح یا بروز مسیح کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ۔ نہ ان میں اس امر کی گنجائش ہے کہ کوئی شخص اس زمانے میں کسی ماں کے پیٹ اور کسی باپ کے نطفے سے پیدا ہو کر یہ دعوٰی کر دے کہ میں ہی وہ مسیح ہوں جس کے آنے کی سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی ۔ یہ تمام حدیثیں صاف اور صریح الفاظ میں اُن عیسٰی علیہ السّلام کے نازل ہونے کی خبر دے رہی ہیں جو اب سے دو ہزار سال پہلے باپ کے بغیر حضرت مریم کے بطن سے پیدا ہوئے تھے ۔ اس مقام پر یہ بحث چھیڑنا بالکل لاحاصل ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں یا زندہ کہیں موجود ہیں بالفرض وہ وفات ہی پا چکے ہوں تو اللہ انہیں زندہ کر کے اٹھا لانے پر قادر ہے" (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۱۶۳)

آپ اوپر نقل ہونے والی دونوں تحریروں کو پڑھیئے اور پھر خود ہی کہیئے کہ آمد ثانی کی وہ تشریح جو ایک نبی اللہ نے کی اور مودودی صاحب نے اسے یہودیوں کے ضمن میں بطور حجت مانا اسے ہی مسلمانوں کے ضمن میں ماننے سے انہیں کیوں ہچکچاہٹ ہے ؟ اگر یہودیوں کے لئے الیاس کی آمد ثانی آنے والے سو حضرت یحیٰی میں مجسم کر سکتی ہے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گذرے ہوئے حضرت الیاس ہی کی واپسی کا تقاضا کرتی ہے تو پھر مسیح کی آمد ثانی کیوں مرزا غلام احمد علیہ السّلام میں پوری نہیں ہوتی اور "دو ہزار سال پہلے ... مریم

کے بطن سے پیدا ہوئے" مسیح ہی کو واپس لانے کے لیئے قدرتِ الٰہی کو پکارتی ہے آج بھی یہودی جب (PASSOVER) کی عید مناتے ہیں تو ایک کرسی "ایلیا" کے لیئے خالی چھوڑ دی جاتی ہے کیونکہ وہ آج بھی اس کی آمدِ ثانی کے منتظر ہیں بحوالہ تفسیر انجیل متی از ولیم بارسلے بزبانِ انگریزی صفحہ ۹۔)

تعجب ہمیں اس بات پر ہے کہ مندرجہ بالا حدیثوں کو نقل ہی مودودی صاحب نے اس مقصد سے کیا ہے کہ ہر شخص خود ہی معلوم کرے کہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا اور آج اسکو کیا بنایا جا رہا ہے۔

(تفہیم القرآن جلد چہارم: صفحہ ۱۵۴)

گویا وہ مصر ہیں کہ ان احادیث کے ظاہری معنے اس طرح کئے جائیں جیسا کہ انہوں نے سمجھا ہے اور کہ بجز مسیح ناصری کے یہاں کوئی مثیل آنے کا سوال ہی نہیں۔ اگر ان کا یہ اصرار درست ہے تو پھر انہیں اس کا فیصلہ اپنے ہی بیان کردہ اصول کی روشنی میں کرنا ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

اس دنیا میں انسان کی ساری آزمائش صرف اس بات کی ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے یا نہیں اور ماننے کے بعد اتنی اخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود فرماں برداری اختیار کرے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے انبیا کی بعثت میں۔ کتابوں کی تنزیل میں حتیٰ کے معجزات تک میں عقل کے امتحان اور اخلاقی قوت کی آزمائش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح بے پردہ نہیں کر دیا ہے کہ آدمی کے لئے ماننے بغیر چارہ نہ رہے کیونکہ اس کے بعد تو آزمائش بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور امتحان میں کامیابی و ناکامی کا مفہوم ہی باقی نہیں رہتا۔۔۔۔۔ ایمان لانے اور اطاعت میں سر جھکا دینے کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت تمہارے حواس سے پوشیدہ ہے اور تم محض دلیل سے اس کو تسلیم کر کے اپنی دانشمندی کا اور محض فہمائش سے اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر کے اپنی اخلاقی طاقت کا ثبوت دیتے ہو۔

(تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۱۶۰)

کیا مودودی صاحب کو اس کے باوجود بھی اس بات پر اصرار ہے کہ مسیح ناصری ہی کا نزولِ ثانی تسلیم کیا جائے کیونکہ ہمیں کسی مثیل کا وعدہ نہیں دیا گیا؟ کیا ان کا نزول امتحان عقل و فہم کا تقاضا نہیں کرے گا؟ اگر یہاں انسان کی ساری آزمائش ہی اس بات کی ہے کہ وہ اختیار کو کس طور استعمال کرتا ہے اور وہ تھوڑا سا پردہ باقی رہنے سے ہی معلوم ہو سکتا ہے تو مسیح کی بعثت ثانی میں کیا اس آزمائش کی

ضرورت نہیں رہے گی؟ یا شاید مسیح کے ان خصوصی امتیازات کے باعث جو مودودی صاحب مانتے ہیں کہ یہاں بھی اسے استثنائی صورت بخشی جائے گی؟ مودودی صاحب نے ایک اور بحث کے ضمن میں عقل وفہم کی آزمائش وامتحان کا ایسا تعطل قبول نہیں کیا گو ان کی وہ بحث تفہیم القرآن کے صفحات میں نہیں ہے:۔

"حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دینا جس سے عقلی آزمائش کا کوئی موقعہ باقی نہ رہے حکمت خداوندی کے خلاف ہے کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اس سنت کو امام مہدی ہی میں بدل دے گا اور ان کی بیعت کے وقت آسمان سے منادی کرے گا کہ لوگو یہ ہمارا خلیفہ مہدی ہے اس کی سنو اور اطاعت کرو۔"
(ترجمان القرآن جون ۱۹۶۳ء)

عیسائیت کے تذکرہ میں حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے حضور عیسائیوں کے وفد نجران کی آمد کے واقعہ کے ضمن میں مودودی صاحب نے مباہلہ والی آیت کو لکھ کر اس پر مندرجہ ذیل حاشیہ لکھا ہے

"فیصلہ کی یہ صورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وفد نجران جان بوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے ...... اس لئے جب اس سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمہیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلہ میں دعا کرو کہ جو جھوٹا ہے اس پر خدا کی لعنت ہو۔ تو ان میں سے کوئی مقابلہ کے لئے تیار نہ ہوا۔" (تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۲۶۱)

مودودی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ خدا کی لعنت سے مراد کیا تھی اور وہ کس طرح ظاہر ہوتی ہے اور اس میں کون سی ایسی ہیبت تھی کہ نجران کے پادری اس کے خوف سے مقابلہ کے لئے تیار نہ ہوئے؟

مودودی صاحب آیت "قَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْن" میں جھوٹے نبیوں کے ہلاک ہونے کے قائل نہیں اور عدم فلاح سے مراد وہ بالآخر ناکام ہونا لیتے ہیں۔ وہ ناکامی دنیاوی تحریکات کی کامیابی یا عدم کامیابی کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے اور یوں بھی ہو سکتا ہے کہ دنیاوی طور پر کوئی کامیاب ہو لیکن خدا تعالےٰ کے نزدیک وہ کذاب ہو۔ لیکن اگر جسمانی ہلاکت اور عذاب آیات مباہلہ اور قطع الوتین میں مراد نہیں تھے اور نجران کے پادریوں نے آیت مباہلہ کا یہی مفہوم نہیں سمجھا تھا تو پھر انہیں مقابلہ میں آنے سے کون سی چیز مانع تھی ایمان تو وہ پھر بھی حضور پر نہیں لائے اور عدم ایمان کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جانا انہیں آخرت کی باز پرس سے بھی بچا نہیں سکتا تو پھر انہوں نے مباہلہ سے فرار کر کے کس بات سے اپنے آپ کو محفوظ کر

لیا تھا ظاہر ہے کہ وہ حفاظت دنیاوی عذاب ہی سے ہو سکتی تھی ۔ ہمیں تعجب ہے کہ جو حقیقت نجران کے وفد پر کھلی رہی مودودی صاحب اس سے انکاری ہیں :۔

"بعض نادان لوگ فلاح کو طویل عمر یا دنیوی خوشحالی یا دنیوی فروغ کے معنی میں لیتے ہیں اور نتیجہ یہ نکالنا چاہتے ہیں کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کر کے جیتا ہے یا دنیا میں پھلے پھولے یا اس کی دعوت کو فروغ نصیب ہو اسے نبی برحق مان لینا چاہیئے کیونکہ اس نے فلاح پائی ۔ اگر وہ نبی برحق نہ ہوتا تو جھوٹا دعویٰ کرتے ہی مار ڈالا جاتا یا بھوکوں مار دیا جاتا اور دنیا میں اس کی بات چلنے ہی نہ پاتی یہ احمقانہ استدلال صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاح فلاح کا مفہوم جانتا ہو اور نہ اس قانون امہال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالےٰ نے مجرموں کے لئے مقرر فرمایا ہے" (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۲۷۲)

ایک طرف مندرجہ عبارت ہے جس میں کسی کذاب کے دنیاوی طور پر کامیاب ہو جانے کو اس کے کذاب ہونے کی نفی نہیں کہا جا سکتا دوسری طرف مندرجہ ذیل عبارت کو دیکھیں :۔

"نبی اللہ کے اذن (SANCTION) سے دعوت دینے کو اٹھتا ہے اس کی دعوت نری تبلیغ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے بھی اس کے بھیجنے والے رب العالمین کی فرماں روائی کا زور ہوتا ہے اسی بنا پر اللہ کے بھیجے ہوئے داعی کی مزاحمت خود اللہ کے خلاف جنگ قرار پاتی ہے جس طرح دنیوی حکومتوں میں سرکاری کام انجام دینے والے سرکاری ملازم کی مزاحمت خود حکومت کے خلاف جنگ سمجھی جاتی ہے ۔ (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۱۰۸)

ہمیں تعجب ہے کہ یہ کس فرماں روا کے زور کا ذکر ہو رہا ہے ۔ جس کی مملکت میں اس سے منسوب کر کے ایک مفتری اپنی دوکان چمکاتا ہے اور اسے کوئی پکڑ نہیں ہوتی اور اگر صادق اپنی دعوت دیتا ہے لیکن اس کے مخالفوں کو کوئی مٹا نہیں سکتا ۔ پھر بھی وہ زور آور ہے کہ اس کی مزاحمت گویا اس کے خلاف اعلان جنگ ہے کچھ اسی مفہوم کا شاخسانہ انہوں نے آیت قطع الوتین پہ لکھا ہے :۔

"بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ غلط استدلال کیا ہے کہ جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کرے اس کی رگِ دل یا رگِ گردن اگر اللہ تعالےٰ کی طرف سے فوراً نہ کاٹ ڈالی جائے تو یہ اس کے نبی ہونے کا ثبوت ہے حالانکہ اس آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ سچے نبی کے بارے میں ہے جھوٹے مدعیوں کے بارے میں نہیں ہے جھوٹے مدعی تو نبوت ہی نہیں خدائی تک کے دعوے کرتے ہیں اور زمین پہ مدتوں دندناتے پھرتے ہیں ۔ یہ ان

کی صداقت کا ثبوت نہیں ہے" (تفہیم القرآن جلد ششم صفہ ۸۱)

اب اگر یہ استدلال درست ہے کہ یہ آیت سچے نبی کے بارے میں ہے اگر وہ نعوذ باللہ کوئی جھوٹ بولے تو اس کی شہ رگ کٹ جاتی ہے جھوٹا مدعی جو چاہے کرے اسے خوف نہیں تو سورۃ الاحقاف میں مودودی صاحب نے آیت:۔ قل ان افتریتہ فلا تملکون لی من اللہ شیئاً کا ترجمہ :۔

"ان سے کہو اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ نہ بچا سکو گے۔ جو تم باتیں بناتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لئے کافی ہے اور وہ بڑا درگذر کرنے والا الرحیم ہے" (تفہیم القرآن۔ جلد چہارم صفہ ۱۴)

اگر یہاں پر بھی آخرت ہی کی پکڑ مراد ہے تو وہ مخاطبوں پر حجت کیونکر ہو گی کیونکہ وہ تو ابھی پردۂ غیب میں ہے اور یہاں اسے بطور دلیل پیش کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ پکڑ اسی دنیا میں ہو۔ تبھی وہ کسی مدعی کے صدق یا کذب کی گواہی ہو سکتی ہے اور یہ والی آیت میں کیا یہ دعوٰی نہیں کہ میں نے اگر نعوذ باللہ جعل سازی کی ہو تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکتے تھے۔ یہاں تو بعض اِلَّا قَادیٰل والا حصر بھی نہیں ہے کہ مودودی صاحب یہ کہہ سکیں کہ اگر سچا نبی کسی بات پر جھوٹ بولے اور اسے اللہ کی طرف منسوب کرے تو ایسی حالت میں اس کو پکڑے جانے کا قانون آیت قطع الوتین میں بیان کیا گیا ہے اور جھوٹا نبی بقول ان کے مدتوں دندناتا پھرے اسے کسی دنیاوی پکڑ کا خوف نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ قانون امہال کے تحت اسے مہلت تشر حاصل ہے یہاں تو دعوٰی کو مطلق جعل سازی کہا گیا ہے اور اس کا ترجمہ :۔ "تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکو گے" کا اعلان ہے۔

پھر سورۃ بنی اسرائیل میں حضور کو مخاطب کر کے اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :۔

" وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ اس کا ترجمہ مودودی صاحب نے یوں کیا ہے :۔ (۱۷:۷۳-۷۵)

"اے محمد ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔ اگر تم ایسا

کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوسرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوسرے عذاب کا۔ پھر ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ پاتے"۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۶۳۲)

اس پر حاشیہ لکھتے ہوئے مودودی صاحب نے کہا ہے :۔

اگر تم حق کو جان لینے کے بعد باطل سے کوئی سمجھوتا کر لیتے .... تو خدا کا غضب تم پر بھڑک اٹھتا اور تمہیں دنیا و آخرت دونوں میں دوہری سزا دی جاتی"۔

یہ درست ہے کہ یہاں ذکر سچے نبی کا ہے ۔ لیکن معاملہ" اپنی طرف سے کوئی بات گھڑنے" کا بھی تو ہے اوّل تو سچے نبی کے بارے میں جھوٹ گھڑنے کا احتمال خود ایک گستاخی ہوگا۔ ہمیں علم نہیں کہ مودودی صاحب ایک ایسے احتمال کو اپنے ذہن میں جگہ کس طرح دیتے ہیں لیکن اگر ایک سچے نبی کو صرف جزاً ایک یا چند باتوں کے گھڑنے پر اتنی سخت وعید سنائی جا سکتی ہے تو وہ جس کا تمام کاروبار ہی جھوٹ ہو اس پر کسی گرفت کا نہ ہونا عجیب دکھائی دیتا ہے ۔ ثانیاً ہم جس نکتے پر توجہ منعطف کروانا چاہتے ہیں وہ "دنیا میں دوہرا عذاب" کا پہلو ہے۔ اگر بازپرس آخرت میں ہی ہے تو یہاں کس قسم کے دنیاوی دوہرے عذاب دیئے جانے کا ذکر ہے مودودی صاحب نے یہ آیت قطع الوتین کے حاشیہ میں" ...... رگ گردن اگر خدا تعالےٰ کی طرف سے فوراً نہ کاٹ ڈالی جائے ......" میں فوراً کا لفظ داخل کر کے شاید یہ بیان کرنا چاہا ہے کہ گو انہوں نے ضرور کہا ہے کہ جھوٹے مدعی کو قانون امہال اور آخرت کی بازپرس کے باعث دنیا میں گرفت کا خوف نہیں پھر بھی بالآخر گرفت ہوتی ہے ۔ مگر نہ جانے کس خوف کے تحت وہ یہ تعین کرنا مناسب نہیں سمجھتے کہ فوراً سے وہ کم از کم یا زیادہ سے زیادہ کس قدر مدت اس گرفت کے ظہور کے لئے ضروری سمجھتے ہیں ۔ یہ ایک متضاد کیفیت کا اظہار ہے کیونکہ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ قطع الوتین کی آیت میں جو قانون بیان ہوا ہے سورۃ آل عمران کی آیت بھی اسی کی غماز ہیں۔ اور فلاح کے جس معنی کا وہ سہارا لے رہے ہیں خدا تعالےٰ کا مقصد اس سے وہ نہیں ورنہ مباہلہ والی آیت کا کوئی وزن باقی نہ رہے گا۔

انبیاءؑ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا قرآن پاک میں ذکر کیا گیا ہے ۔ مودودی صاحب نے

بجا طور پر اس قصہ گوئی کو محض قصہ گوئی کی خاطر نہیں بلکہ سبق آموزی کے لئے ان کا حوالہ دینا بیان کیا ہے وہ خود مانتے ہیں کہ تاریخی واقعات کے بیان میں وہ قصے کے صرف ان اجزا کو پیش کرتا ہے جو اس کے مقصد و مدعا سے کوئی تعلق رکھتے ہیں باقی تمام تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن مسیح کے بارے میں وہ اس اصول کو ترک کر دیتے ہیں۔ وہ پرانی روش ہی کو اپناتے ہوئے کہتے ہیں :۔

حضرت عیسٰے علیہ السلام کی پیدائش کا معاملہ یہودی قوم میں فی الواقع ذرہ برابر بھی مشتبہ نہ تھا بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے اسی روز اللہ تعالےٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنا دیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت کا بچہ ہے جس کی ولادت معجزہ کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اخلاقی جرم کا۔ جب بنی اسرائیل کے ایک شریف ترین اور مشہور و نامور مذہبی گھرانے کی بن بیاہی لڑکی گود میں بچہ لئے ہوئے آئی اور قوم کے بڑے چھوٹے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر ہجوم کر کے آ گئے تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کی بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمہیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت سے کہا کہ اس بچہ سے ہم کیا پوچھیں جو گہوارے میں لیٹا ہوا ہے مگر یکایک وہ بچہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ انی عبد اللہ اٰتٰنی الکتٰب وجعلنی نبیا۔ (تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۱۴۱)

نہ جانے یہ سب باتیں مودودی صاحب نے کس جگہ لکھی دیکھی ہیں کیونکہ عیسائیوں میں تو ایسی کوئی روایت موجود نہیں یا کم از کم ہماری نظر سے نہیں گذری کہ مسیح کی ولادت پر سینکڑوں ہزاروں کا مجمع ہجوم کر کے ان کے گھر آ گیا تھا۔ رہا یہ کہ مسیح نے گہوارے میں لیٹے لیٹے کلام کیا تو اس کی بھی شہادت بائبل میں موجود نہیں رہا قرآن پاک کا یہ کہنا کہ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصّٰلِحِينَ ؂ تو اس میں اگر مسیح کی انسانی حیثیت کا اظہار مراد لیا جائے تو عین ممکن ہے کیونکہ اگر گہوارے کا کلام اعجاز شمار کیا جاتا ہے تو کہولت کا کلام تو اعجاز نہیں ہو سکتا کیونکہ کروڑوں انسان کہولت میں باتیں کرتے ہیں پھر مِنَ الصّٰلِحِينَ ہونا بھی کوئی انہیں کا اعجاز نہیں ہاں اس سے مسیحیوں کو یہ بتانا مقصود ہو سکتا ہے کہ دیگر انسانوں کی طرح مسیح بھی بچپن اور بڑھاپے سے گذرے اور دیگر صالحین کی طرح وہ بھی انسانی حیثیت میں صالح ہوئے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت مریم کو بشارت میں بچے کی صرف

جسمانی حالتوں کی کیفیت بتائی گئی ہو کہ وہ بچہ لمبی عمر پائے گا باتیں کرے گا اور صحیح وسالم ہو گا کیونکہ یہی چیزیں کسی ماں کو بچہ کی پیدائش سے قبل بے چین کرتی ہیں لیکن مودودی صاحب ایسی تشریحات کو نہیں مانتے۔ وہ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا۔ کا ترجمہ ہم اس سے کیا بات کریں، جو گہوارے میں پڑا بچہ ہے کرکے ان لوگوں پر برس پڑے جو اس کا ترجمہ "ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے" کرتے ہیں۔ مودودی صاحب کہتے ہیں:۔

"قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے یعنی ان کے نزدیک یہ گفتگو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جوانی کے زمانے میں ہوئی اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گہوارے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر جو شخص موقع ومحل اور سیاق وسباق پر کچھ بھی غور کرے گا وہ محسوس کرلے گا کہ یہ محض ایک مہمل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کے لئے کی گئی ہے"۔ (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۶۶)

اب یہ سارا الجھاؤ صرف اسی لئے تو ہے کہ مودودی صاحب ان اصولوں کو بھی فراموش کر جاتے ہیں جو خود بیان کرچکے ہوتے ہیں۔ کیا انہوں نے قرآن کے طرز بیان میں اس خاصیت کا ذکر نہیں کیا تھا کہ بعض قصص کے صرف ضروری حصوں کا بیان کرنا ہی قرآن نے ضروری سمجھا ہے اور تفصیلات یا درمیانی وقفوں کو چھوڑ دیا ہے یہاں انہوں نے ولادت مسیح اور کلام مسیح کے درمیان کی مدت جس میں مسیح جوان ہو کر منصب نبوت پر فائز ہو چکے سبھی کو باہم ملا دیا ہے۔ جبھی تو وہ محل وموقع اور سیاق وسباق کا ذکر کر رہے ہیں حالانکہ یہ محل وموقع اور سیاق وسباق کو آیت میں متصل ہونا ماننے کے اعتبار سے منفصل ہے۔ مودودی صاحب کو یہ گمان لفظ "صَبِيًّا" سے ہوا ہے لیکن کیا یہ طریق کلام نہیں کہ بڑے بوڑھے اپنے لئے چھوٹوں کو "بچہ" ہی کہتے ہیں۔ چاہے وہ بچہ تیس چالیس سال کا ہی کیوں نہ ہو چکا ہو۔ مودودی صاحب اسے معنوی تحریف کہتے ہیں۔ اور ہمیں اس پر تعجب ہے۔

مودودی صاحب نے حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں ایک روایت نقل کی ہے:۔

"ابن عباس کی روایت ہے کہ ایک دفعہ کعب بن اشرف (مدینہ کا یہودی سردار) مکہ آیا تو قریش کے سرداروں نے اس سے کہا: الاترى الى هذا الصبى المنبتر من قومه يزعم انه خير منا ونحن اهل الحجيج واهل السدانة واهل السقاية۔ بھلا دیکھو تو سہی اس لڑکے کو جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ ہم سے بہتر ہے کہ ہم حج اور سدانت

اور سفاہت کے منتظم ہیں (ہزآن)" (تفہیم القرآن جلد ششم صفحہ ۹)

اب کیا یہ سچ نہیں کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نبوت پر فائز ہونے وقت چالیس برس کے تھے اور قریش کے سرداروں نے ان کے لئے لفظ "ھذا الصبی" استعمال کیا تو اگر یہودی بوڑھوں نے مسیح کی دعوت پر ان کی والدہ سے شکایت کی اور مسیحؑ سے بات کرنے کو کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّا کہہ کر رد کر دیا تو وہاں مسیح کو گہوارے کا بچہ کیوں کہا جائے اور ایسے خطاب کو زعم بزرگی اور پندار عمر کیوں نہ سمجھا جائے جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قریش کے سرداروں کو اپنے بارے میں تھے۔

مودودی صاحب کو محل و موقع اور سیاق و سباق پر اصرار ہے۔ ان کا یہ اصرار شاید اس لئے ہے کہ یہاں حضرت مریمؑ کے مسیح کے ساتھ قوم میں واپس آنے کا ذکر ہے اور پھر یہودی بڑے بوڑھوں کا حضرت مریم سے سوال کرنا آجاتا ہے جس کا جواب حضرت مریمؑ نے خود نہیں دیا بلکہ مسیح کی طرف اشارہ کر دیا کہ مسیح سے پوچھو۔ اس پر بوڑھوں کا استعجاب ظاہر کرتا ہے کہ شاید مسیح ابھی گہوارے میں ہی تھے۔ ورنہ سیاق و سباق مجروح ہو جاتا ہے۔ اوّلاً، جیسا ہم عرض کر چکے ہیں۔ حضرت مسیح کی پیدائش اور مریم کا چپ کا روزہ رکھنا اور ان کا قوم کی طرف مسیحؑ کی ہمراہی میں آنا دو متصل واقعات نہیں، اور ان کے درمیان سالہا سال کا فاصلہ ہے لیکن اگر مودودی صاحب کا سیاق و سباق کا اصرار درست ہے تو بڑے بوڑھوں کا سوال ضرور عصمت مریمؑ کے بارے میں ہوا ہوگا۔ (حالانکہ ایسا آیت قرآنی میں درج نہیں) جواب میں مسیح کو مریمؑ کی بریت میں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ لوگو میں معجزے کی پیدائش ہوں جس میں کسی غیر قانونی انسانی دخل کا شک کر کے تم لوگ گنہگار ہو رہے ہو۔ اگر سیاق و سباق میں کسی الزام کی طرف اشارہ ہے اور اس کے ابطال کی تائید میں اس گہوارائی کلام کا صدور اس معجزے کی علت غائی ہے تو پھر مسیح نے جو کلام کیا تھا اس میں اس بات کا کوئی تو ذکر ہوتا کہ میں معجزہ کی پیدائش ہوں۔ وہاں تو دعویٰ نبوت و رسالت کا اعلان ہے۔

مودودی صاحب کہتے ہیں کہ مسیح کی پیدائش کا معاملہ یہودی قوم میں ذرہ برابر مشتبہ نہ تھا اور جس روز وہ پیدا ہوئے تھے اسی روز اللہ تعالے نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنا دیا تھا۔ تو اس کا

مطلب یہ ہوا کہ جب اس گہوارے کے کلام میں مسیحؑ نے اپنی نبوت و رسالت کا اعلان کیا تھا تو وہ سینکڑوں ہزاروں لوگ جنہیں مودودی صاحب ہجوم کروا کے حضرت مریم کے گھر لے آتے ہیں۔ انہوں نے اس وقت مسیحؑ کی نبوت و رسالت کو بھی تسلیم کر لیا ہوگا؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ اور اگر ہاں تو بتیس برس بعد ان یہودیوں نے مسیحؑ کو صلیب دینے کو کیوں سوچا؟ مودودی صاحب یہ تو مانتے ہیں کہ یہودیوں نے مسیحؑ کو تسلیم نہیں کیا تھا بھی ان کو صلیب دینے کے درپے ہوئے۔ اور یہ بھی مودودی صاحب مانتے ہیں کہ یہودیوں میں زنا کی سزا سنگساری تھی۔ اور بائبل سے یہ بھی ثابت ہے کہ کسی ناجائز اولاد کو ہیکل میں لانا یا کسی ایسے شخص کا جو ناجائز طور پر پیدا ہوا ہو ہیکل میں داخل ہونا ممنوع تھا۔ اب اگر معجزہ بن باپ کی پیدائش کا تھا تو یہودیوں نے مسیح کو تسلیم نہ کر کے بتا دیا کہ وہ اس کی معجزانہ پیدائش کے قائل نہیں۔ ظاہر ہے کہ دوسری صورت اَسْتَغْفِرُ وَاللّٰهَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مسیح کی ناجائز ولادت کی ہو سکتی تھی۔ لیکن مسیح کو کبھی ہیکل میں داخل ہونے سے نہیں روکا گیا۔ بلکہ عہد نامہ جدید گواہ ہے کہ مسیح ہیکل میں بڑے بوڑھوں سے باتیں کرتے تھے نہ ہی مریمؑ پر کوئی حد جاری کی گئی اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہودی نہ تو مریمؑ پر بدکاری کا کوئی الزام دھر پائے نہ انہوں نے مسیحؑ کو نعوذ باللہ ناجائز اولاد سمجھا۔ وہ ان کو اسی طرح کا انسان ہی سمجھے جیسا کہ دوسرے لوگ ہوتے ہیں تبھی ان کو بقول اہل یہود دعوئے الوہیت یا ابنیت پر لائق سزا ٹھہرایا۔

مزید برآں یہاں تو یہ دیکھیں کہ یہ باتیں قرآن پاک کہہ کیوں رہا ہے؟ اللہ تعالےٰ نے اس کے آخر میں کہا ہے ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ۔ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ یعنی یہاں اللہ تعالےٰ عیسائی عقیدہ ابن اللہ کو غلط کہہ رہے ہیں اور حضرت عیسیٰ کی بشریت کا اثبات کر رہے ہیں۔ اگر بن باپ کی بات کا ہی اثبات تھا تو پھر ظاہراً عیسائی عقیدہ ابنیت کی تکذیب کس طرح ہوئی؟

بعض دیگر انبیاؑ کے حالات بیان کرتے ہوئے مودودی صاحب نے وہی باتیں لکھی ہیں جو پرانے مفسر پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ اس طرح اس پہلو میں بھی ہمیں کوئی تحقیقی اضافہ نظر نہیں آتا ہمارا

مطلب ہے کہ یہاں بھی ہمیں پرانے مفسرین ہی کی روش کا تتبع تفہیم القرآن میں نظر آتا ہے اسرائیلیات نے جس طرح ہمارے مفسرین کو متاثر کیا ہے اس پر تو کتابیں لکھی جاسکتی ہیں لیکن خود اسرائیلیات میں جس طرح جھوٹ اور سچ باہم خلط ملط ہوگئے ہیں اس کا خیال رکھنا ایک ہوشمند مفکر و مفسر قرآن کا فرض ہے کیونکہ انہی اسرائیلی روایات نے انبیائؑ کے کردار پر بہت سے بدنما دھبے لگا دیئے جو صریحاً عصمت انبیائؑ کے خلاف ہیں :-

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مودودی صاحب نے گو کوشش تو کی ہے کہ ایسے واقعات کو بیان کرتے وقت انبیائؑ کے کردار کو بہتر اور صاف دکھائیں لیکن بعض گھناؤنی تفاصیل کے امکان کو واقعتاً درست مان کر ان کی صفائی کی کوشش چنداں کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ حالانکہ ان تفاصیل کو درست مان لینے کی کوئی وجہ نہیں۔ محض اس لئے کہ وہ یوں ہی شہرت پاگئی ہیں ان میں کچھ نہ کچھ درست ہوگا کا مفروضہ چاہے ذہن کو کتنا ہی مرغوب ہو ضروری نہیں کہ حقیقت بھی اسی طرح ہو۔ مثلاً حضرت داؤد علیہ السّلام ہی کے واقعات کو لیں۔ وہ ایک اولوالعزم نبی تھے۔ ان کے حضور دو آدمی ننانوے دنبیوں والا مقدمہ لے کر آئے جو قرآن پاک میں مذکور ہے۔ بدقسمتی سے ایک کہانی اسرائیلی روایات میں بھی بیان ہوتی چلی آئی ہے جو کچھ اس انداز کی ہے کہ کسی نبی کے کردار میں اس کا وقوع کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ ورنہ وہ نبی نبوّت کے مقام پر نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ تعالےٰ خود انبیاؑ کو مقام عصمت پر رکھتے ہیں۔ مودودی صاحب کو اصرار ہے کہ اس اسرائیلی کہانی کی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہوگی۔ تبھی تو اسرائیلی روایات نے اسے نقل کیا ہے وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ واقعہ من وعن درست نہ ہوگا لیکن کچھ نہ کچھ درست ضرور ہوگا چنانچہ اپنے ذہن سے پھر خود ہی واقعہ کی تفصیلات اور اندازاً ممکنات کا ایک ہیولیٰ بُن لیتے ہیں کہ :-

"اصل واقعہ جو قرآن مجید کے مذکورہ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السّلام نے اُوریاہ (یا جو کچھ بھی اس شخص کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرمانروا اور ایک زبردست عظمت رکھنے والی شخصیت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی اس لئے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا۔" (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۳۲۷)

مودودی صاحب نے یہ جو لکھا ہے کہ "قرآن مجید کے مذکورہ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے" یہ قرآن پاک پر بہت بڑی زیادتی ہے۔ قرآن پاک میں کہاں وہ بیان ہے جو مودودی صاحب نے اوپر نقل کر دیا ہے حالانکہ اسی حاشیہ کی ابتداء میں انہوں نے لکھا ہے:۔

"اس قصے اور اس کی شہرت کی موجودگی میں یہ ضرورت باقی نہ تھی کہ قرآن مجید میں اس کی کوئی تفصیل بیان کی جاتی۔ اللہ تعالےٰ کا یہ قاعدہ ہے بھی نہیں کہ وہ اپنی کتاب پاک میں ایسی باتوں کو کھول کر بیان کرے اس لئے یہاں پردے پردے ہی میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا اور اہل کتاب نے اسے بنا کیا دیا ہے" (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۳۲۸)

اب اوپر کے دونوں اقتباسات جو در اصل متصلاً ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہیں خود ایک دوسرے کی نقیض ہیں ایک طرف تو کہہ رہے ہیں قصہ کی شہرت کے باعث ایسے قصے کی تفصیلات قرآن میں نہیں۔ پردے پردے کا اشارہ ہے اور پھر خود ہی ایک بیان بھی درج کر دیتے ہیں جو بہت صاف ہے۔ حالانکہ قرآن پاک میں نہ اوریاہ نہ کسی اور کی بیوی کا ذکر یا اشارہ ہے نہ حضرت داؤد کی کسی خواہش نفس کو بیان کیا گیا ہے پھر یہ کتنی بڑی جسارت ہے کہ کہا جائے:۔

"مفسرین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک بات تک پہنچا ہے اور قرآن پاک کے واضح اشارات سے قصے کی اصل حقیقت پا گیا ہے حضرت داؤد نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا کہ اس عورت کے شوہر سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اپنی بیوی کو میرے لئے چھوڑ دے" (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۳۲۹)

قرآن پاک کے واضح اشارے ہمیں تو نظر نہیں آئے۔ اور اگر بالفرض اسرائیلوں کے ہاں یہ قصہ ہی درج نہ ہوتا اور جس طرح کی شہرت بقول مودودی صاحب کے اسے حاصل ہوگئی نہ ہوتی تو کیا ان اشاروں سے جن میں مودودی صاحب واضح کہہ رہے ہیں اسے سُنا جا سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ پھر اس بات کو تو سوچیئے کہ اس "جلیل القدر فرمانروا" اور "اس زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیت" کا آپ پر کیا تاثر پڑتا ہے جو ننانوے بیویوں یا بقول مودودی صاحب "متعدد بیویوں" کے باوجود ایک اور کی منکوحہ کو حاصل کرنے کے لئے اسے کہتا ہے کہ اپنی بیوی کو چھوڑ دے تاکہ میں اس سے شادی کر لوں"۔ ایسے جلیل القدر فرمانروا کی رعایا کی عزت و عظمت ایسے فرمانروا سے کیسے محفوظ ہوگی۔ کیا اس پر بھی غور کیا گیا ہے۔ کیا کسی نبی کا چلن ہے

کہ وہ اپنی دنیاوی اور دینی عظمت کو اپنی نفس کی خواہش کے لئے استعمال کرے چاہے وہ بالواسطہ ہی سہی۔

پھر آخر اس قصے کو جو بقول مودودی صاحب اشاروں اور پردوں میں بیان کیا گیا ہے قرآن پاک میں جس سیاق و سباق میں رکھا گیا ہے اُس میں اُس طرح جیسا کہ مودودی صاحب اسے کسی اسرائیلی شہرت یافتہ قصے کی بازگشت کہہ کر شرح کرتے ہیں کوئی مفہوم بنتا بھی ہے یا نہیں۔ مودودی صاحب خود کہتے ہیں کہ :۔

"سلسلۂ کلام پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں اس مقام پر یہ قصہ دو اغراض کے لئے بیان کیا گیا ہے پہلی غرض نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کرنا ہے اور اس مقصد کے لئے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان پر صبر کرو اور (۱) ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو یعنے نہیں تو ساحر اور کذاب ہی کہا جا رہا ہے لیکن ہمارے بندے داؤد پر تو ظالموں نے زنا اور سازشی قتل تک کے الزامات لگا دیئے لہٰذا ان لوگوں سے جو کچھ بھی تم کو سننا پڑے اسے برداشت کرتے رہو۔

دوسری غرض کفار کو یہ بتانا ہے کہ تم لوگ ہر محاسبے سے بے خوف ہو کر دنیا میں طرح طرح کی زیادتیاں کرتے چلے جاتے ہو لیکن جس خدا کی خدائی میں تم یہ حرکتیں کر رہے ہو وہ کسی کو بھی محاسبے کے بغیر نہیں چھوڑتا حتیٰ کہ جو بندے اس کے نہایت محبوب و مقرب ہوتے ہیں وہ بھی اگر ایک ذراسی لغزش کے مرتکب ہو جائیں تو خداوند عالم ان سے سخت مواخذہ کرتا ہے اس مقصد کے لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ ان کے سامنے ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کرو جو (۲) ایسی خوبیوں کا مالک تھا مگر جب اس سے ایک بے جا بات سرزد ہو گئی ہو تو دیکھو کہ ہم نے اسے کس طرح سرزنش کی"۔ (ایضاً صفحہ ۳۴۳)

ہم نے حاشیہ میں (۱) اور (۲) عبارتوں کو نمبر لگا دیا ہے کہ ان دونوں کا تضاد نمایاں ہو سکے۔ پہلے قصے کا اوّل مقصد یہ ہے کہ غلط الزامات پر صبر کرو۔ قصے کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ لغزش پر سرزنش ہوتی ہے۔ اب آپ ہی کہیئے یا پہلی بات درست ہے یا دوسری۔ اگر الزام غلط ہے تو سرزنش کیسی اور اگر الزام درست ہے تو صبر کی تلقین کرنا کیا خود تعجب انگیز نہیں۔ یہ مقاصد جو مودودی

صاحب بیان کر رہے ہیں اس طرح تو حاصل نہیں ہو سکتے ۔ مودودی صاحب نے کہا ہے کہ اس قصے پر تفصیلی بحث انہوں نے اپنی کتاب تفہیمات جلد دوم میں کی ہے اور جو اصحاب مودودی صاحب کی بیان کردہ تاویل کی ترجیح کے مفصل دلائل معلوم کرنا چاہیں وہ اسے دیکھیں ۔ بدقسمتی سے وہ کتاب اس وقت ہمارے سامنے نہیں کہ ہم اس میں بیان کردہ دلائل کو دیکھ سکیں ۔ البتہ ایک اقتباس اس کا پیغام صلح کی ایک اشاعت میں درج ہوا تھا اور ہمیں گمان غالب ہے کہ درست ہی نقل ہوا ہوگا ۔ ایک دلیل اس میں نقل کردہ یہ ہے :۔

"جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہو سکتی ہے اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہونے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں ۔ اور یہ جان لیں کہ یہ بشر ہیں خدا نہیں "

(تفہیمات جلد دوم : بحوالہ پیغام صلح ۲۵ جون ۱۹۵۷ء)

گویا مودودی صاحب مانتے ہیں کہ حضرت داؤد سے غلطی ہوئی چاہے کسی مصلحت خداوندی کے سبب ہوئی ہو ۔ تو پھر حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اَصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ کیوں کہا جا رہا ہے ؟ مودودی صاحب ہی تو کہہ رہے ہیں کہ اگر تجھے ساحر اور کذاب نَعُوْذُ بِاللّٰہِ کہا جا رہا ہے تو داؤد کو بھی تو نعوذ باللہ زانی اور سازشی قاتل کہا گیا تھا ۔ مگر داؤد پہ سے مصلحت خداوندی میں حفاظت ہٹالی گئی تھی اور ایک دو لغزشیں ہو جانے دی گئی تھیں تاکہ لوگ اسے انسان سمجھیں ۔ ہم اس سے آگے کچھ نہیں کہتے کیونکہ جائے ادب ہے :۔

یہ سب الجھن مودودی صاحب کو صرف اس لئے ہے کہ اوّلاً تو ننانوے دنبیوں کا مقدمہ انہیں اوریا حتی کی بیوی کا واقعہ یاد دلا دیتا ہے ۔ اور دوسرے حضرت داؤد کا خیال کہ میرے رب نے مجھے اس مقدمہ کے ذریعہ یا ان دو مقدمہ لانے والوں کے اچانک آجانے سے آزمایا ہے اور وہ خدا تعالےٰ کے حضور جھک گئے اس سے وہ سمجھے ہیں کہ ضرور حضرت داؤد کو اوریا حتی کی بیوی والی لغزشیں یاد آئی ہوں گی اور تیسری بات کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت داؤد کو مخاطب کر کے کہا کہ تو خلیفۃ اللہ ہے اس لئے حق و انصاف سے فیصلے کر اور خواہشات کی پیروی نہ کر ۔ اس لئے ضروری انہوں نے

اوریاحتیٰ کی بیوی کے معاملے میں خواہش کی پیروی کی ہو گی کہ سرزنش ہو گئی۔

اب ضروری نہیں کہ اوپر بیان کردہ باتوں کا پس منظر اوریاحتیٰ کی بیوی ہی ہو اگر مودودی صاحب یہی کہہ دیتے کہ قرآن پاک نے اس واقعہ کا ذکر نہ کرکے اور صرف ننانوے دنبیوں والے مقدمہ کو دہرا کر بتایا ہے کہ اصل واقعہ صرف اس قدر تھا جسے لوگوں نے بگاڑ کر کچھ کا کچھ بنا دیا ہے تو بھی شاید بات بنتی۔ انہوں نے تو اس کے ڈانڈے پورے کے پورے ملا دیئے ہیں۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ اس واقعہ کا بیان خالصتہً نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بتانے کے لئے ہے کہ مخالفتیں تو صاحب جبروت بادشاہوں کو بھی گھبرا دیتی ہیں اور سازشیں ان کے خلاف بھی ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالےٰ ان تمام کو دور کر سکتا ہے۔ داؤد خدا تعالےٰ کے نبی اور بادشاہ دو آدمیوں کو اچانک اپنے پاس یوں چلے آتے ہوئے دیکھ کر گھبرا گئے۔ پھر انہوں نے جو بات کہی وہ کفار عرب کے اس وقت کے طرز فکر اور طریق کار کی ترجمان تھی کہ وہ ننانوے دنبیوں کے مالک ہیں۔ وہ آپ کو کمزور سمجھ کر دبا لینا چاہتے ہیں جیسا کہ مودودی صاحب نے اسی سورت کی تمہید میں قریش مکہ کے وفد کا ذکر کرکے بتایا ہے۔ وہ ابوطالب کے پاس اسی لئے گئے تھے داؤد سمجھ گئے کہ یہ مقدمہ دراصل ان کے توکل علی اللہ اور انصاف کا امتحان ہے۔ اور رہا کبھی سجدۂ شکر بجالانا ہے اگر وہ امتحان میں کامیاب رہے۔ رہا یہ کہ اللہ تعالےٰ نے داؤد کو سرزنش کیوں کی اور یہ کیوں کہا:۔

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (۲۶:۳۸)

تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ اسے سرزنش ہی سمجھا جائے۔ یہ ایک عمومی اصول کے طور پر بات بیان کی گئی بھی تو ہو سکتی ہے۔ آخر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی تو کہا گیا تھا۔

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۳۹:۶۵)

تو کیا وہ واقعی شرک کی طرف نعوذ باللہ راغب تھے۔

اسی طرح یوسف علیہ السلام کے بارے میں بھی مودودی صاحب نے کچھ ایسا ہی راستہ

اختیار کیا ہے ہاں یہ درست ہے کہ یوسف علیہ السّلام اور انبیاؑ کے بارے میں عموماً مودودی صاحب دوسروں سے صرف اس حد تک مختلف ہیں کہ وہ انبیاؑ کی تحریک کو خالصتاً سیاسی نوعیت کی دعوت بنا کر جا نچتے ہیں۔ ہمیں یہ بات نہ انبیاؑ کے طرزِ کلام و کردار میں ملتی ہے اور نہ قرآن پاک ایسی بات کہتا ہے بلکہ اس کے برعکس کفّار کا یہ الزام انبیاؑ پر ہوتا ہے کہ یہ دراصل زمین کی حاکمیت ہم سے چھین لینا چاہتے اور ہمیں نکال کر خود قابض ہو جانا چاہتے ہیں۔ اس کا جواب کہیں بھی قرآن پاک میں یہ نہیں کہ ہاں یہ درست ہے کہ زمین سے تمہیں نکال کر انبیاؑ ایک نیا نظامِ حکومت چلانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ اس کو اپنا مقصد کہتا تو پھر کفّار کے اس الزام کو الزام کی حیثیت میں نقل نہیں کر سکتا تھا۔ اس بات کا احساس مودودی صاحب کو بھی ہے :-

”یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک غلام قوم کا ایک بے سروسامان آدمی یکایک اٹھ کر فرعون جیسے بادشاہ کے دربار میں کھڑا ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ تو محض اس کے فعل سے ۔۔۔۔۔ اتنی بڑی سلطنت کو یہ خطرہ کیسے لاحق ہو جاتا ہے کہ یہ اکیلا انسان سلطنت مصر کا تختہ الٹ دے گا اور شاہی خاندان کو حکمران طبقہ سمیت ملک کے اقتدار سے بے دخل کر دے گا جبکہ اس شخص نے صرف نبوّت کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ پیش کیا اور کسی قسم کی سیاسی گفتگو سرے سے چھیڑی ہی نہیں؟

اُس کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام کا دعویٰ نبوّت اپنے اندر خود ہی یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ دراصل پورے نظامِ زندگی کو بحیثیت مجموعی تبدیل کرنا چاہتے ہیں جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے“۔ (تفہیم جلد دوم صفحہ ۶۶ — ۶۷)

اب یہ تو گاڑی کو گھوڑے سے آگے لگانے والی بات ہے اگر یہ استدلال درست ہے تو فرعون کے اس اعتراض کو قرآن نے کیا قبول کر لیا ہے :-

”اس نے کہا۔ لوگو ذرا دیکھو۔ یہ تمہارے باپ دادا کو گمراہ اور جہنمی ٹھہراتا ہے۔ اس نے کہا لوگو ہوشیار ہو جاؤ یہ پیغمبر ویغمبر کچھ نہیں۔ اقتدار کا بھوکا ہے۔ چاہتا ہے کہ یوسف کے زمانے کی طرح پھر بنی اسرائیل یہاں حکمران ہو جائیں اور قبطی قوم سے سلطنت چھین لی جائے“ (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۱۱)

اس سے قطع نظر کہ یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر کے حاکم نہ تھے اور نہ حکومت اہل قبط کے ہاتھ سے چھنی ہوئی تھی لیکن فرعون کے منہ سے جو اعلان مودودی صاحب نے کروایا ہے اور قبط کے قومی مفاد کے اعتبار سے فرعون نے جس اندیشے کی نشاندہی کی ہے کیا مودودی صاحب کے بیان کردہ مسلک انبیاء کو درست مان لینے سے اس اعلان یا اندیشوں میں کوئی غلط بات کہی جا رہی تھی؟ اگر غلط نہ تھی اور یہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعویٰ میں پنہاں مقصود بھی تھا تو پھر فرعون کیا ان اندیشوں کے اظہار میں سچا نہ تھا؟ اس کا جواب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وَیۡلَکُمۡ لَا تَفۡتَرُوۡا عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا فَیُسۡحِتَکُمۡ بِعَذَابٍ وَ قَدۡ خَابَ مَنِ افۡتَرٰی ۔ (۲۰ ۔ ۶۱)

اس کا ترجمہ مودودی صاحب نے ہی یہ کیا ہے :۔

''موسیٰ نے کہا ۔ شامت کے مارو نہ جھوٹی تہمتیں باندھو اللہ پر ورنہ وہ ایک سخت عذاب سے تمہارا ستیا ناس کر دے گا ۔ جھوٹ جس نے بھی گھڑا وہ نامراد ہوا'' (۲۰ ۔ ۶۱)

پھر جادوگروں سے مقابلہ ۔ معجزوں اور عذاب کا نزول ۔ بنی اسرائیل کی ہجرت یہ سب باتیں کیا تھیں؟ مقصود و مطلوب تو مصر میں ایک ہمہ گیر سیاسی انقلاب لانا تھا اور مودودی صاحب کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں وہ مصری بھی تھے جنہوں نے حضرت موسیٰ کی دعوت قبول کر کے دین موسوی یا بقول مودودی صاحب اس زمانے کا اسلام قبول کر لیا تھا ۔ پھر مصر سے فرار اس انقلاب کے برپا کرنے سے ایک قسم کا اعراض نہ تھا ۔ ہمیں ان دو مختلف طریقہائے عمل میں مطابقت دکھائی نہیں دیتی اگر مودودی صاحب کا خیال درست ہے تو ہمیں یہ بھی عجیب لگتا ہے کہ فرعون کے ان الفاظ کو قرآن نے کیونکر نقل کیا ۔

''یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے دار السلطنت میں ملی بھگت کر کے کی ہے تاکہ سلطنت سے اس کے مالکوں کو بے دخل کر دو'' (ترجمہ آیت ۱۲۳ سورۃ الاعراف تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۸۶)

اگر مودودی صاحب کی بات مان لی جائے تو ''بے دخل کرنا'' ہی تو موسیٰ علیہ السلام کا مقصود تھا ۔ اسے اعتراض کے طور پر نقل کرنا چہ معنی دارد ۔ فرعون تو پھر بڑا بلند نظر تھا کہ اسے نبوت موسوی میں پنہاں راز صاف نظر آ گیا تھا حالانکہ صاحب دعوت نے اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا ۔ پھر فرعون کو صرف دنیا کی خوشحالی دیکھ سکنے والا کوتاہ نظر شخص سمجھنا یقیناً ایک غلط فہمی ہوگی کیونکہ وہ خوب ہی سمجھدار ثابت ہوا ۔

جیساکہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں قرآن پاک نے انبیاء کی زندگی کے بعض اہم واقعات کسی نہ کسی موقع و محل پر اس کی مناسبت اور کسی ضرورت سے بیان کئے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کو اس نے ذرا تفصیلاً درج فرمایا ہے۔ مودودی صاحب نے سورۂ یوسف کی تفسیر میں بھی اسی سیاسی پہلو ہی کو غالب حیثیت دی ہے۔ اور اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر میں شاید ماتحت یا ثانوی حیثیت حاصل تھی اور کہ ملک کا اصل اور مطلق حکمران فرعون مصر تھا۔ آپ نے اوپر موسیٰ علیہ السلام کے ضمن میں ایک نقل کردہ اقتباس میں دیکھا ہوگا انہوں نے وہاں بھی یاد کروانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت یوسفؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر کے حاکم تھے۔

"لوگو ذرا دیکھو ۔۔۔۔ یہ پیغمبر و پیغمبر کچھ نہیں اقتدار کا بھوکا ہے چاہتا ہے کہ یوسف کے زمانے کی طرح پھر بنی اسرائیل یہاں حکمران ہو جائیں اور قبطی قوم سے سلطنت چھین لی جائے۔" (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۱۰۱)

اب یہ تاریخ کو غلط پڑھنا ہی نہیں بلکہ اس کے آثار اور واقعات کے علی الرغم غلط بات کہنا ہے یہ بنی اسرائیل کی تاریخ کو اپنے پاس سے بنا ڈالنا ہے کہ فرعون مصر کا حاکم نہ تھا بلکہ یوسف علیہ السلام حاکم تھے کہ وہ دین الملک نہیں بلکہ شریعت کو وہاں نافذ کر رہے تھے۔ ہمیں تعجب ہے کہ یہ سب باتیں قرآن پاک کے صریح الفاظ کے باوجود کہی جاتی ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل ترجمہ مودودی صاحب نے ان آیات کا کیا ہے جس سے صاف حضرت یوسفؑ کی حیثیت ثانوی نظر آتی ہے۔

"اس طرح ہم نے یوسفؑ کی تائید اپنی تدبیر سے کی اس کا یہ کام نہ تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) میں اپنے بھائی کو پکڑتا الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔" (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۲۷)

اس پر حاشیہ نمبر ۲ لکھتے ہوئے انہوں نے کہا ہے:۔

"ظاہر ہے کہ اللہ کا پیغمبر زمین میں دین اللہ جاری کرنے کے لئے مبعوث ہوا تھا نہ کہ دین الملک جاری کرنے کے لئے اگر حالات کی مجبوری سے اس کی حکومت میں اس وقت تک پوری طرح دین الملک کی جگہ دین اللہ جاری نہ ہو سکا تھا تب بھی کم از کم پیغمبر کا اپنا کام تو یہ نہ تھا کہ اپنے ایک شخصی معاملہ میں دین الملک پر عمل کرے۔ لہٰذا حضرت یوسفؑ کا دین الملک کے مطابق اپنے بھائی کو نہ پکڑنا اس بناء پر نہیں تھا کہ دین الملک میں ایسا کرنے کی گنجائش نہ تھی بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ پیغمبر ہونے کی حیثیت میں اپنی ذاتی حد

تک دین اللہ پر عمل کرنا ان کا فرض تھا اور دین الملک کی پیروی ان کے لیے قطعاً نامناسب تھی ۔" (ایضاً صفحہ ۲۲۴)

آپ اسے کسی بھی تاویل سے جائز قرار دینا چاہیں اس کا صاف مطلب بہرحال یہی تو ہے کہ پبلک لا بہرحال دین الملک ہی تھا اور جسے مودودی صاحب شخصی معاملہ کہہ رہے ہیں اور ذاتی حد تک دین اللہ پر عمل کرنا بیان کر رہے ہیں وہ خود بخود اس نکتہ نظر ہی کی حمایت بن جاتا ہے کہ جس کے تحت اگر خالص اسلامی نظام رائج نہ ہو تو کم از کم اپنی ذاتی حد تک لوگوں کو شخصی معاملات میں حتی الوسع اور اللہ پر عمل کرتے ہوئے کافر نظام یا دین الملک کے تحت پبلک نظام سے تعاون کرنا اور اگر ضرورت متقاضی ہو تو اس کے تحت نوکری قبول کرنا جائز ہو جاتا ہے اس کے باوجود مودودی صاحب کسی ایسی صورت حال میں بھی عام مسلمانوں کو یہ جائز نہیں سمجھتے کہ وہ کسی ایسے دین الملک کے تحت امن پسندی سے زندگی گذاریں اور کوئی منصب قبول کرلیں ۔

"حقیقت یہ ہے کہ اس مقام کی تفسیر میں دورِ انحطاط کے مسلمانوں نے کچھ ایسی ذہنیت کا اظہار کیا ہے جو کبھی یہودیوں کی خاصیت تھی یہ یہودیوں کا حال تھا کہ جب وہ ذہنی و اخلاقی پستی میں مبتلا ہوئے تو پچھلی تاریخ میں جن جن بزرگوں کی سیرتیں ان کو بلندی پر چڑھنے کا سبق دیتی تھیں ان سب کو وہ نیچے گرا کر اپنے مرتبے پر اتار لائے تاکہ اپنے لیے اور زیادہ نیچے گرنے کا بہانہ پیدا کریں ۔ افسوس کہ یہی کچھ مسلمانوں نے بھی کیا انہیں کافر حکومتوں کی چاکری کرنی تھی مگر اس پستی میں گرتے ہوئے اسلام اور اس کے علمبرداروں کی بلندی دیکھ کر انہیں شرم آئی لہٰذا اس شرم کو مٹانے اور اپنے ضمیر کو راضی کرنے کے لئے یہ اپنے ساتھ جلیل القدر پیغمبر کو بھی خدمت کفر کی گہرائی میں لے گرے ۔" (ایضاً ص ۴۱۳)

ہمارے نزدیک یہ تمام مؤقف ہی ایک مفروضے پر استوار ہے لیکن یہ مؤقف کتنا خطرناک ہے اس کا اندازہ اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت یوسفؑ کی حیثیت واقعی ثانوی تھی تو نعوذ باللہ وہ خدمت کفر کے مرتکب ہو جاتے ہیں ۔ معاف فرمایئے ہم ایک ایسے مفروضے یا موقف کے حامی نہیں ہو سکتے مزید برآں ایسا نظریہ جو کروڑوں مسلمانوں کی زندگیوں کو یا تو مستقل باغیوں کی حیثیت میں بدل دے یا ان کے اسلام کو ہی داغدار کر کے انہیں کفر کے خادموں کی حیثیت دے دے ہرگز کسی فقہی بصیرت کی غمازی نہیں کرتا اوّلاً تو یہ کہنا ہی غلط ہے کہ کسی طرح بھی غیر مسلموں یا کافروں کی حکومت میں کوئی منصب لینا یا بعض قوانین کو قبول کرنا یا غیر مسلم حکومت کے تحت زندگی بسر کرنا اسلام کے خلاف ہے ۔ اگر ایسا ہوتا تو حضور نبی کریم صلے

اللہ علیہ وسلم کی دور میں مسلمانوں کو حبشہ کی عیسائی سلطنت کے تحت جاکر رہنے کو کبھی نہ کہہ سکتے تھے کیونکہ دونوں جگہ غیر مسلم ہی تو حاکمانہ اختیار رکھتے تھے۔ لیکن حبشہ کے غیر مسلموں کو مکہ کے غیر مسلموں پر حضور نے خود ترجیح دی اور مسلمانوں کو ان کی امان میں بھیجا۔ ہمیں علم ہے کہ بعض لوگ یہاں یہ بحث لے بیٹھے ہیں کہ نجاشی بعد میں مسلمان ہوگیا تھا۔ گو اس کا بھی کوئی حتمی ثبوت موجود نہیں۔ تاہم اس حد تک تو وہ بھی ہم سے متفق ہوں گے کہ جب ہجرت حبشہ کے لئے حضورؐ نے پہلی مرتبہ اجازت دی تھی اس وقت، تو بہر حال اسی علم سے دی تھی کہ حبشہ غیر مسلم عیسائی ریاست ہے۔

یہ حالات جب ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۴۵ھ عام الفیل ۵ نبوی میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ لَوْ خَرَجْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ الْحَبَشَةِ فَإِنَّ بِهَا مَلِكًا لَا يُظْلَمُ عِنْدَهُ أَحَدٌ وَهِيَ أَرْضُ صِدْقٍ حَتَّى يَجْعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ فَرَجًا مِمَّا أَنْتُمْ فِيهِ اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے آؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے جب تک اللہ تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا کرے تم لوگ وہاں ٹھہرے رہو۔" (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۵۳)

"اگرچہ مسلمان ایک مظلوم پناہ گزین گروہ کی حیثیت سے اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا رہے تھے مگر اس حالت میں بھی اللہ تعالے نے ان کو دین کے معاملے میں ذرہ برابر مداہنت کرنے کی تعلیم نہ دی بلکہ چلتے وقت زادِ راہ کے طور پر یہ سورہ ان کے ساتھ کی تاکہ عیسائیوں کے ملک میں عیسٰی علیہ السلام کی بالکل صحیح حیثیت پیش کریں۔" (ایضاً صفحہ ۵۶)

یعنی حضورؐ نے ایک غیر مسلم عیسائی مملکت کے لئے ایک ایسے بادشاہ کو سراہا جو کسی پر ظلم نہیں ہونے دیتا اور اس کی مملکت کو "ارض صدق" یا جیسا کہ مودودی صاحب نے ترجمہ کیا" بھلائی کی سرزمین" کہا۔ حالانکہ وہاں غیر مسلم قوانین ہی رائج تھے۔ اور مسلمان اس کے تحت ہی زندگی بسر کرنے جا رہے تھے۔ وہ نہ تو اس سرزمین کا قانون بدلنے کا کوئی ظاہر مقصد لے کر گئے تھے نہ انہوں نے کوئی ایسا موقف اس وقت بھی نجاشی کے سامنے اختیار کیا جب قریش کا وفد ان کے خلاف شکایت لے کر شاہ حبش کے پاس پہنچا۔ نہ صرف یہی بلکہ تاریخ تو یہ بھی کہتی ہے کہ جب نجاشی کے بعض مخالفوں نے حبشہ پر حملہ کیا تو ان مہاجر مسلمانوں

نے اس کی کامیابی کے لئے دعائیں کیں اور امداد کے لئے تیار ہوئے۔ اب تعجب ہے کہ یہ وہ سب کچھ کیوں ایک غیر مسلم کے لئے کر رہے تھے۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا مودودی صاحب نے جو کچھ حضرت یوسف کے حالات سے استدلال کیا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں؟ ان کا یہ کہنا کہ :۔

"حضرت یوسف کا دین الملک کے مطابق اپنے بھائی کو نہ پکڑنا اس بنا پر نہیں تھا کہ دین الملک میں ایسا کرنے کی گنجائش نہ تھی بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ پیغمبر ہونے کی حیثیت میں اپنی ذاتی حد تک دین اللہ پر عمل کرنا ان کا فرض تھا اور دین الملک کی پیروی ان کے لئے قطعاً نامناسب تھی۔" (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۲۲)

یہ محض ان کا ذاتی خیال ہے۔ جب قرآن پاک صریحاً کہہ رہا ہے کہ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ تو پھر یہ استدلال کیونکر بجا ہے کہ اس میں پکڑنے کی گنجائش تھی۔ مودودی صاحب کو اس آیت کے اس ترجمے پر بھی اعتراض ہے "یوسفؑ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو نہ پکڑ سکتا تھا" ان کے نزدیک ما کان لیاخذ کو مترجمین اور مفسرین کا عدم قدرت کے معنی میں لینا نہ کہ عدم صحت اور عدم مناسبت کے معنی میں درست نہیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ :۔

"اگر اس کے وہ معنی لئے جائیں جو مترجمین و مفسرین بالعموم بیان کرتے ہیں تو بات بالکل مہمل ہو جاتی ہے بادشاہ کے قانون میں چور کو نہ پکڑ سکنے کی آخر وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا دنیا میں کبھی کوئی سلطنت ایسی بھی رہی ہے جس کا قانون چور کو گرفتار کرنے کی اجازت نہ دیتا ہو۔"

اگر یہ درست ہے تو پھر حضرت یوسفؑ نے دین الملک میں کیوں نہ اپنے بھائی کو پکڑ لیا۔ مودودی صاحب کہتے ہیں کہ بہ حیثیت پیغمبر یہ ان کے لئے مناسب نہ تھا۔ کیونکہ یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا۔ یعنی جرم تو دین الملک کے تحت ہی چوری کا ہوا تھا۔ بجز حضرت یوسفؑ کے کسی اور کو اس بات کا علم بھی نہ تھا کہ چور حضرت یوسفؑ کا بھائی ہے اور سزا بھی چور کو ہی ملنی چاہیے تھی لیکن معاملہ ذاتی حد تک یوسف علیہ السلام کا بن گیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ چور ان کا بھائی ہے۔ غور تو فرمائیے کہ یہ کس قسم کا استدلال ہے کیا یہی ایک طریقہ تھا جس سے یہ ثابت کیا جا سکتا تھا کہ حضرت یوسفؑ پیغمبر خدا ہیں اور دین الملک نہیں بلکہ دین اللہ نافذ کرنے پر مامور ہیں؟ کیا صرف یہی ایک صورت تھی جہاں مودودی صاحب کے نزدیک قدرت کی بجائے

مناسبت کا مظاہرہ ہو سکتا تھا۔ یعنی دین الملک میں تو گنجائش گرفت تھی لیکن گرفت کی قدرت ہونے کے باوجود دین الملک کے تحت گرفتار کرنا چونکہ پیغمبر کے مقام ماموریت کے باعث مناسب نہ تھا اس لیے دین اللہ کے تحت گرفتار کرنا ہی درست سمجھا گیا۔ لیکن یہ مقام بھی جسے مودودی صاحب نے یوسف علیہ السلام کے مقام ماموریت کے "بین" اظہار کا نکتہ ماسکہ بنا دیا ہے اور مثال کے طور پہ چنا ہے اور جو صرف ایک ہی مقام ہے جہاں حضرت یوسف کی وزارت یا بقول مودودی صاحب کے ڈکٹیٹری یا حکومت کے دور میں دین الملک سے ظاہری علاحدگی اور دین اللہ کی عملی تنفیذ کا مظاہرہ کرنا حضرت یوسف کو میسر آیا اسے مودودی صاحب نے کیسے بیان کیا ہے سے ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہیے۔

جب حضرت یوسف کے بھائی بن یامین دوسرے بھائیوں کے ساتھ مصر آئے تو حضرت یوسف نے اپنے بھائی کو الگ بلایا اور بتا دیا کہ "میں تمہارا بھائی ہوں" اب تو ان باتوں کا غم نہ کر جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں:۔

اس فقرے میں ساری داستان سمیٹ دی گئی ہے جو اکیس بائیس برس کے بعد دونوں ماں جائے بھائیوں کے ملنے پر پیش آئی ہوگی ...... بن یامین نے سنایا ہوگا کہ ان کے پیچھے سوتیلے بھائیوں نے اس کے ساتھ کیا کیا بدسلوکیاں کیں پھر حضرت یوسف نے بھائی کو تسلی دی ہوگی کہ اب تم میرے پاس رہو گے ان ظالموں کے پنجے میں تم کو دوبارہ نہیں جانے دوں گا بعید نہیں کہ اسی موقعہ پر دونوں بھائیوں میں یہ بھی طے ہو گیا ہو کہ بن یامین کو مصر میں روک رکھنے کے لئے کیا تدبیر کی جائے جس سے وہ پردہ بھی پڑا رہے جو حضرت یوسف علیہ السلام مصلحتاً ابھی ڈالے رکھنا چاہتے تھے۔

پیالہ رکھنے کا فعل غالباً حضرت یوسف نے اپنے بھائی کی رضامندی سے اور اس کے علم سے کیا تھا جیسا کہ اس سے پہلے والی آیت اشارہ کر رہی ہے (یعنی بن یامین کی خرجی میں سرکاری پیالہ رکھ کر چوری کا الزام لگانے کے لئے مواد مہیا کرنا۔ ناقل) حضرت یوسف اپنے مدتوں کے بچھڑے ہوئے بھائی کو ان ظالم سوتیلے بھائیوں کے پنجے سے چھڑانا چاہتے ہوں گے ...... اس کے لئے دونوں بھائیوں میں مشورہ ہوا ہوگا کہ اسے روکنے کی تدبیر کی جائے اگرچہ تھوڑی دیر کے لئے اس میں بھائی کی سبکی تھی کہ اس پر چوری کا دھبہ لگتا تھا لیکن بعد میں یہ دھبہ اس طرح بآسانی دھل سکتا تھا کہ دونوں بھائی اصل معاملہ کو دنیا کے سامنے ظاہر کر دیں ...... آیات میں ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں جس سے یہ گمان کیا

جاسکے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے ملازموں کو اس راز میں شریک کیا تھا اور انہیں خود یہ سکھایا تھا کہ قافلے والوں پر جھوٹا الزام لگاؤ۔ واقعہ کی سادہ صورت جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ پیالہ خاموشی سے رکھ دیا گیا ہوگا بعد میں جب سرکاری ملازموں نے اسے نہ پایا ہوگا تو قیاس کیا ہوگا کہ ہو نہ ہو یہ کام انہی قافلے والوں میں سے کسی کا ہے جو یہاں ٹھہرے ہوئے تھے (ایضاً جلد دوم ص۴۱۹)

یعنی وہ شخص جو اللہ کا قانون نافذ کرنے کے لیے مامور ہے اس کے نفاذ کا اظہار کرنے کے لئے ایک نعوذ باللہ سازش بناتا ہے، اور جس کو مودودی صاحب کہتے ہیں کہ مصر میں حاکم اعلےٰ کے درجے پر تھا اور :۔

"ساری سرزمین مصر اس کی تھی ۔۔۔۔۔ یہ گویا اس کا کامل تسلط اور ہمہ گیر اقتدار کا بیان ہے جو حضرت یوسفؑ کو اس ملک میں حاصل تھا ۔۔۔۔ ابن زید کے حوالے سے علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ ۔۔۔۔۔ دنیا کے اس حصے میں وہ جہاں جو کچھ چاہتا کر سکتا تھا وہ سرزمین اس کے حوالہ کر دی گئی تھی حتیٰ کہ اگر وہ چاہتا کہ فرعون کو اپنا زیر دست کر لے اور خود اس سے بالاتر ہو جائے تو یہ بھی کر سکتا تھا" (تفہیم القرآن جلد دوم ص۴۱۳)

یہ شخص ایک طرف اتنا بلند بیان کیا جاتا ہے اور دوسری طرف دین الملک میں اتنا بے بس کہ اپنے بھائی کو روکنے کے لئے اسے ایک ایسی مکروہ سازش میں شریک ہونا پڑا جسے چوری کا دھبہ کہہ کر مودودی صاحب نے تسلیم کیا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ چور یا چور کا شریک دونوں جرم کے ارتکاب کی صورت میں برابر کے مجرم ہوتے ہیں یہ اس شخص کا کردار ہے جو :۔

"قرآن۔ بائبل۔ اور تلمود کی متفقہ شہادت ہے کہ درحقیقت یوسف علیہ السلام سلطنت مصر کے مختار کل (روحی اصطلاح میں ڈکٹیٹر) بنائے گئے تھے اور ملک کا سیاہ و سپید سب کچھ ان کے اختیار میں دے دیا گیا تھا" (ایضاً ص۴۱۱)

اور یہ ساری سازش کیوں تھی؟

یعنی یہ بات حضرت یوسف علیہ السلام کی شانِ پیغمبری کے شایان نہ تھی کہ وہ اپنے ایک ذاتی معاملہ میں شاہِ مصر کے قانون پر عمل کرتے۔ اپنے بھائی کو روک رکھنے کے لئے انہوں نے خود تدبیر کی تھی اس

میں یہ خلل رہ گیا تھا کہ بھائی کو روکا تو ضرور جا سکتا تھا مگر شاہ مصر کے قانون تعزیرات سے کام لینا پڑتا تھا۔ اور یہ اس پیغمبر کی شان کے مطابق نہ تھا جس نے اختیارات حکومت غیر اسلامی قوانین کی جگہ اسلامی شریعت نافذ کرنے کے لئے اپنے ہاتھ میں لئے تھے۔ اگر اللہ تعالےٰ چاہتا تو اپنے نبی کو اس بدنما غلطی میں مبتلا ہو جانے دیتا مگر اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ دھبہ اس کے دامن پر رہ جائے اس لئے اس نے براہ راست اپنی تدبیر سے یہ راہ نکالی کہ اتفاقاً برادران یوسفؑ سے چور کی سزا پوچھی گئی اور انہوں نے اس کے لئے شریعت ابراہیمی کا قانون بتا دیا۔۔۔۔ ایک بندے کے اس سے بڑھ کر بلندی درجہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگر وہ کبھی بشری کمزوری کی بنا پر خود کسی لغزش میں مبتلا ہو رہا ہو تو اللہ تعالےٰ غیب سے اس کو بچانے کا انتظام کر دے۔" (ایضاً ص۱۲۴)

یعنی چوری کی سازش میں شریک ہوتا تو کوئی بشری لغزش نہ تھی جس سے بچنے کا سامان اللہ تعالےٰ کرتے لیکن یہ بات کہ سزا کس قانون کے تحت دی جائے وہ بشری کمزوری تھی جس کا دھبہ اگر پڑ جائے تو اللہ تعالیٰ کی تدبیروں میں فرق آجاتا۔ استغفراللہ کیا یہ اس نبی کا کردار ہم بتا رہے ہیں جس کی عصمت و عفت کو قرآن پاک نے مثالی کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ جو اپنے ذاتی چلن کی پاکیزگی کو ثابت کرنے کے لئے صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ جب تک اس پر لگائے گئے الزامات کی صفائی نہیں ہوتی وہ جیل سے باہر نہیں آئے گا ہمیں تعجب ہے کہ مودودی صاحب نے اپنے غلط سیاسی نظریے کی تائید میں جو انہوں نے دین اللہ کو سیاسی اور حکومتی تغلب کا مترادف بنانے کا اختیار کر رکھا ہے مقام یوسفؑ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے یا تو یہ غلو ہے کہ دِیْنِ الْمَلِكِ کے تحت حکومت چلانا اگر درست ہو یا اس معاملہ میں جسے مودودی صاحب ذاتی اور شخصی قرار دے رہے ہیں حضرت یوسف دین الملک پر عمل کرتے تو:۔

"سوال اس پر بھی ختم نہیں ہوتا اس سے بھی زیادہ نازک اور سخت تر ایک دوسرے سوال پر جا ٹھہرتا ہے یعنی یہ کہ حضرت یوسفؑ ایک راستباز آدمی بھی تھے یا نہیں؟" (ایضاً ص۱۴۱)

یعنی مودودی صاحب کی نظر میں حضرت یوسفؑ اگر:۔

"خود اس نظام حکومت کے خادم بلکہ ناظم اور محافظ اور پشت پناہ تک بن جائے جو شاہ مصر کی زیر نگیں چل رہا تھا۔" (صفحہ ۱۴۳)

تو حضرت یوسفؑ کی راستبازی میں کلام پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ خود چوری کی اسکیم بنائے اور خود

ہی وہ فعل بھی کر گذرے یا اپنے بھائی سے کروا دے تو بھی اس کی راستبازی قائم رہتی ہے کیونکہ مودودی صاحب کہتے ہیں کہ ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے ملازموں کو اس راز میں شریک کیا تھا۔ اس فعل سے عصمت نبوت داغدار نہیں ہوتی۔ کیونکہ مودودی صاحب کے نزدیک ایسا فعل جائز ہے اور انہوں نے اس سے ایک مستقل اصول بھی اخذ کیا ہے جسے وہ اصطلاح شریعت میں "توریہ" کہتے ہیں۔ یعنی اس تمام اسکیم کے تحت جب چوری کا مال برآمد ہو جاتا ہے اور دوسرے بھائی کہتے ہیں :۔

"اس (یعنی بن یامین۔ ناقل) کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے اسکی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیں۔ ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں۔ یوسفؑ نے کہا پناہ بخدا دوسرے کسی شخص کو ہم کیسے رکھ سکتے ہیں جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرے کو رکھیں گے تو ہم ظالم ہوں گے"۔ (سورۃ یوسف آیات ۷۸، ۷۹۔ ترجمہ مودودی صاحب)

ان آیات پر مودودی صاحب حاشیہ لکھتے ہیں :۔

"احتیاط ملاحظہ ہو کہ "چور" نہیں کہتے بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اسی کو اصطلاح شریعت میں توریہ کہتے ہیں یعنی حقیقت پر پردہ ڈالنا۔ یا امر واقعہ کو چھپانا جب کسی مظلوم کو ظالم سے بچانے یا کسی بڑے مظلمہ کو دفع کرنے کی صورت اس کے سوا نہ ہو کہ کچھ خلاف واقعہ بات کہی جائے یا کوئی خلاف حقیقت حیلہ کیا جائے تو ایسی صورت میں ایک پرہیزگار آدمی صریح جھوٹ بولنے سے احتراز کرتے ہوئے ایسی بات کہنے یا ایسی تدبیر کرنے کی کوشش کرے گا جس سے حقیقت کو چھپا کر بدی کو دفع کیا جا سکے ایسا کرنا شرع و اخلاق میں جائز ہے۔ بشرطیکہ کام نکالنے کے لئے ایسا نہ کیا جائے بلکہ بڑی برائی کو دور کرنا ہو۔ اب دیکھئے کہ اس سارے معاملہ میں حضرت یوسفؑ نے کس طرح جائز توریہ کی شرائط پوری کی ہیں بھائی کی رضامندی سے اس کے سامان میں پیالہ رکھ دیا مگر ملازموں سے یہ نہیں کہا کہ اس پر چوری کا الزام لگاؤ"۔ (ایضاً ص ۴۲۵)

یہی نہیں۔ مودودی صاحب دو قدم اور آگے بڑھتے ہیں :۔

"اس قسم کے توریہ کی مثالیں خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں بھی ملتی ہیں اور کسی دلیل سے بھی اس کو اخلاقاً معیوب نہیں کہا جا سکتا"۔ (ایضاً ص ۴۲۵)

لیجئے۔ کہاں غزوات۔ جہاں دشمن کی جنگی چالوں کا مقابلہ عسکری حیلہ جوئی سے ہی کیا جاتا ہے اور

کہاں یہ بے ضرر صورت حال جس میں لوگ قحط سے بے حال ہو کر غلہ خریدنے آئے ہیں اپنے بوڑھے باپ کو پیچھے چھوڑ کر اور یہ عہد کر کے آئے ہیں کہ بن یامین کو ضائع نہیں کریں گے بلکہ واپس لائیں گے۔ نہ انہوں نے مودودی صاحب کے بیان کردہ تفصیلات میں بن یامین سے کوئی برائی کی نہ ان کا برائی کا کوئی ارادہ تھا خود یوسفؑ نے بن یامین کو روکنا چاہا اور چوری کی تمام اسکیم نعوذ باللہ خود تیار کی اور سامان میں پیالہ رکھ دیا۔ (ہمیں معلوم نہیں ہو سکا کہ "بھائی کی رضامندی" کا علم مودودی صاحب کو کہاں سے ہوا کیونکہ یہ بات بائبل اور قرآن میں تو مذکور نہیں اور نہ شاید تالمود میں ہو کیونکہ اگر ہوتی تو مودودی صاحب ضرور اس کا اقتباس درج کرتے) اب آپ ہی کہیے کہ یہ "توریہ" کس بھلائی کے ازالہ کے لئے تھا۔ تفسیر تفہیم القرآن کے مطالعہ میں ہمیں ایسے بیشتر مقامات ملے جہاں مودودی صاحب کو اگر کوئی مشکل پیش آئی ہے تو انہوں نے خود قیاساً واقعات کا اپنے مطلب یا تخیل کے مطابق برپا ہونا فرض کر لیا ہے۔ یہاں توریہ کی خاطر انہوں نے یوسفؑ اور بن یامین کی سازش فرض کر کے تمام واقعات کا اسی طرح ہوا ہونا بیان کر دیا ہے۔ یہ سب اسلئے کیا کہ دین الملک کے تحت یوسفؑ بن یامین کو روک نہیں سکتے تھے۔ لیکن پھر وہی یوسفؑ ہیں کہ اپنے پورے خاندان کو پورے کروفر کے ساتھ مصر میں آنے پر استقبال بھی کرتے ہیں اور انہیں وہیں آباد بھی کرتے ہیں۔

"تلمود میں لکھا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ کی آمد کی خبر دارالسلطنت میں پہنچی تو حضرت یوسفؑ سلطنت کے بڑے امراء و اہل مناصب اور فوج فرا کو لے کر ان کے استقبال کے لئے نکلے اور پورے تزک و احتشام کے ساتھ ان کو شہر لائے" (ایضاً صفحہ ۳۴۱)

پھر یہ اصول جسے "توریہ" کے نام سے محمود و مقبول اصول بنایا جا رہا ہے اس کے اثرات کیا ہو سکتے ہیں۔ اس کے تحت تو سچی بات کا اخفا کسی معصوم کو مجرم بنا دینے کے لئے جائز ہو سکتا ہے کیونکہ فاعل اپنے آپ کو یہ کہہ کر حق بجانب ہوا لے گا کہ اس نے کسی بڑی بدی کو دور کرنے کے لئے ایک چھوٹا فعل بدگوارا کر لیا ہے۔ تعجب ہے کہ یوسف علیہ السلام کو تو کسی ایسے فعل کی ضرورت ہی نہ تھی وہ تو مودودی صاحب کی نظر میں ویسے ہی ملک مصر میں ماتحت حالت میں نہ تھے کیا یہ باتیں ظاہر نہیں کرتیں کہ توریہ نامی اصول کی بنیادیں خود ریت پر ہیں۔ کیونکہ اگر واقعی یہ تشریح درست ہے جو مودودی صاحب نے کی ہے تو پھر چاہے اسے کتنے ہی حسین و جمیل خاکوں میں سجایا جائے حضرت یوسفؑ کے کردار پر جو بدنما داغ اس

سے لگتا ہے وہ عصمت یوسفی کو مکمل طور پر سیاہ کر دیتا ہے۔ تعجب ہے کہ وہ شخص جو اس وقت جبکہ عزیز مصر کے ہاں ایک ادنیٰ حیثیت میں عزیز مصر کی عورت سے اپنا دامن صاف بچا کر لے گیا ایک قریب قریب حاکمانہ اور ذمہ دارانہ مقام پر پہنچ کر خود ایک جرم کا مرتکب ہوا اور الزام اپنے بھائی پر دھر بیٹھا۔ مودودی صاحب کہتے ہیں کہ بعد میں انہوں نے اصل معاملہ عوام کو بتا دیا ہوگا۔ اس کی کوئی شہادت انہوں نے نہیں دی۔ یہ تو درست ہے کہ بن یامین پکڑے گئے چوری کے الزام میں اور مودودی صاحب کے کہنے کے مطابق یوسفؑ کو چوری کا علم تھا۔ اور جب اعلان ہوا کہ اے قافلے والو تم چور ہو تو وہ خاموش بیٹھے رہے۔ کیا قرآن پاک میں نہیں:-

ومن یکسب خطیئۃ او اثما ثم یرم بہ بریئا فقد احتمل بھتانا واثما مبینا (۴:۱۱۲)

اور جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا اس نے تو بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا۔ (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۳۹۶)

ایسا آدمی جو ایسی حرکت کرے اس کے بارے میں آپ کا ذہن جو بھی سوچ لے وہ بعید از امکان نہیں:-

ضمناً ایک اور عجیب بات ہمیں مودودی صاحب کی تفسیر سے معلوم ہوئی ہے وہ کہتے ہیں:-

اس دوران میں یقیناً انہوں نے مصر میں اسلام کی خوب تبلیغ کی ہوگی۔ اہل مصر میں سے جو لوگ اسلام لائے ہوں گے ان کا مذہب ہی نہیں بلکہ ان کا تمدن اور پورا طرز زندگی غیر مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے ہم رنگ ہو گیا ہوگا مصریوں نے ان سب کو اجنبی ٹھہرایا ہوگا۔ جس طرح ہندوستان میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو ٹھہرایا، ان کے اوپر اسرائیلی کا لفظ اسی طرح چسپاں کر دیا ہوگا جس طرح غیر عرب مسلمانوں پر محمڈن کا لفظ آج چسپاں کیا جاتا ہے۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۴۳)

اس "تمام کی ہوگی" اور "کیا ہوگا" میں سب سے پہلے عجیب بات غیر عرب مسلمانوں کے لئے محمڈن کے لفظ کے استعمال کی دریافت ہے۔ کم از کم ہمیں آج تک معلوم نہ تھا کہ لفظ غیر عرب مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔

حضرت یوسفؑ کے بارے میں ہم نے مودودی صاحب کی تفسیر سے تفصیلاً اور لمبے اقتباسات اس لئے درج کئے ہیں کہ ان کے سیاسی نظریئے کے ضمن میں انہیں اس پر بہت کچھ شدت سے انحصار کرنا پڑا

ہے اور وہ اسے اپنے موقف کی تائید میں لاتے ہیں حالاں کہ یہ صریحاً ان کے خلاف جاتا ہے حضرت یوسفؑ کی بحث میں بھی مودودی صاحب کو ایک اور الجھن کا بھی سامنا ہوا ہے کہ:۔

"سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک مصر کی حکومت میں دین الملک ہی جاری تھا۔ اب اگر اس حکومت کے حاکم اعلےٰ حضرت یوسفؑ ہی تھے جیسا کہ تم پہلے ثابت کر چکے ہو تو اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت یوسفؑ خدا کے پیغمبر خود اپنے ہاتھوں سے ملک میں دین الملک جاری کر رہے تھے۔ اس کے بعد اگر اپنے ذاتی معاملہ میں حضرت یوسف نے دین الملک کی بجائے شریعت ابراہیمی پر عمل کیا تو اس سے فرق کیا واقع ہوا۔ اس کا جواب تو یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ مامور تو دین اللہ جاری کرنے ہی پر تھے۔ اور یہی ان کا پیغمبرانہ مشن اور ان کی حکومت کا مقصد تھا مگر ایک ملک کا نظام عملاً ایک دن کے اندر نہیں بدل جاتا۔۔۔۔۔ نظام عدالت اور قانون کو بالفعل بدلنے کے لئے برسوں لگ جائیں گے۔۔۔۔ کیا تاریخ اس بات پر شاہد نہیں کہ خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی عرب کے نظامِ زندگی میں پورا انقلاب برپا کرنے کیلئے نو دس برس لگے تھے۔۔۔۔۔۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے ابتدائی دور میں جب تک قوانین اسلامی جاری نہ ہوئے تھے لوگ پرانے طریقے کے مطابق شراب پیتے رہے مگر کیا حضورؐ نے بھی پی۔ لوگ سود لیتے دیتے تھے مگر کیا آپؐ نے بھی سودی لین دین کیا۔ لوگ متعہ کرتے رہے اور جمع بین الاختین کرتے رہے مگر کیا حضور نے بھی ایسا کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی اسلام کی عملی مجبوریوں کی بناء پر احکام اسلامی کے اجراء میں تدریج سے کام لینا اور چیز ہے اور اس کا خود اس تدریج کے دور میں جاہلیت کے طریقوں پر عمل کرنا اور چیز ہے"۔ (ص۴۲۳)

اس مندرجہ بالا اقتباس کے فکری مغالطوں کو دیکھئے۔ اولاً حضرت یوسفؑ اور حضرت نبی صلے علیہ وسلم کی حالتیں صریحاً مختلف تھیں۔ حضور خود سربراہ ریاست تھے۔ حضرت یوسفؑ نہ تھے۔ حضور سے پہلے کی عرب سوسائٹی رسم و رواج پر چل رہی تھی ان کے پاس ایک دیسی ترقی یافتہ ریاست اور قانون تھا ہی نہیں جیسا مصریوں کا تھا اور جس کے لئے قرآن نے دین الملک کا لفظ استعمال کیا ہاں مدینہ کے یہود کو اس نوع میں کسی حد تک شمار کر سکتے ہیں۔ رہا تدریجاً قوانین وضعی یا دین الملک کو بدل کر شریعت CATEGORY ابراہیمی کو رائج کرنا تو کم از کم واقعہ زیر بحث میں تو دونوں قوانین ایک ہی سزا دیتے کیونکہ مودودی صاحب

کہتے ہیں دنیا میں کوئی حکومت ایسی نہیں جو چور کو گرفتار نہ کرتی ہو۔ لہٰذا یہ بھی نہ ہوا کہ دونوں قوانین کا اختلاف واضح ہو سکتا تاکہ علم ہو سکتا کہ بعد میں شریعت ابراہیمی دین الملک میں کیا تدریجی تبدیلی لاتی ہے۔ حضور کے حالات سے جو اسلامی انقلاب کے تدریج تو سال میں برپا کرنے کی تائید حاصل کی گئی ہے وہ بھی درست نہیں اسلامی شرع کا نفاذ تو صرف مسلمانوں کے لئے تھا غیر مسلموں کو تو انہی کے حال پر چھوڑا گیا۔ اور مسلمانوں کے بارے میں جو یہ کہا گیا کہ وہ شراب پیتے تھے مگر حضورؐ نہ پیتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ تو عرض ہے کہ مسلمان تبھی شراب پیتے تھے جب وہ حرام نہ تھی۔ تبھی سود دیتے تھے جب حرام نہ تھا۔ اگر حرمت سے قبل حضور ایسا نہ کرتے تھے تو وہ کسی شرعی حکم کے تحت نہ تھا بلکہ وہ حضور کا خالصتاً ایسا ذاتی فعل تھا۔ جو ان کے طبع میں فطرۃً راسخ تھا۔ وہ نہ اس کی طرف اس وقت دعوت دیتے رہے تھے نہ ان کا یہ فعل شرع کے ان احکامات کے تحت جانچا جا سکتا ہے جو بعد میں وحی ہوئے اور نافذ کئے گئے۔ یہاں ایسا مسئلہ ہی نہیں تھا کہ ہم کہہ سکیں کہ:۔

"تدریج کی رخصتیں دوسروں کے لئے ہیں داعی کا یہ کام نہیں ہے کہ خود ان طریقوں ہی سے کسی پر عمل کرے حق کے مٹانے کے لئے وہ مامور ہوا ہے۔"

یہ کیفیت تو بعض نہایت ہی واضح آیات کی ہوئی کہ مودودی صاحب نے ان پر بھی جو استدلال کیا ہے وہ نہ صرف اکثر روایات کا ہی اتباع ہے بلکہ جو اعتراضات انبیاء کی شان اقدس پر ایک ایسے طرز استدلال کے بعد ماضی میں مستشرقین۔ آریہ سماجیوں اور غیر مسلموں نے کئے تھے ان کا بھی کوئی جواب نہ ہو سکا بلکہ ان کی دوبارہ توثیق ہی کر دی گئی ہے۔ لیکن وہ مسائل جو خالص مذہب اور انبیاء کے تعلق باللہ سے بحث میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان پر بھی تفسیر تفہیم القرآن کوئی زیادہ راہنمائی نہیں کرتی۔

مثلاً قرآن پاک کے بعض مشکل مقامات میں سے سورۃ البقرہ کی آیات ۲۵۹ میں بیان کردہ واقعہ بھی ہے جہاں اللہ تعالےٰ نے ایک شخص کا ذکر کیا ہے کہ:۔

"جس کا گذر ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی اس شخص نے کہا کہ یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ تعالےٰ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور پوچھا بتاؤ کتنی مدت

پڑے رہے اس نے کہا ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا فرمایا تم پر سو برس اسی حالت میں گذر چکے ہیں۔"

(ترجمہ آیات از مودودی صاحب)

اس پر مودودی صاحب نے تین مختصر حواشی ۲۹۳ - ۲۹۴ - اور ۲۹۵ لکھے ہیں جو یہ ہیں :-

حاشیہ ۲۹۳ "یہ ایک غیر ضروری بحث ہے کہ وہ شخص کون تھا۔ اور وہ بستی کون سی تھی اصل مدعا جس کے لئے یہاں یہ ذکر لایا گیا ہے صرف یہ بتانا ہے کہ جس نے اللہ تعالےٰ کو اپنا ولی بنایا اسے اللہ تعالےٰ نے کس طرح روشنی عطا کی، شخص اور مکان دونوں کی تعین کا نہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ اس کا کوئی فائدہ البتہ بعد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن صاحب کا یہ ذکر ہے وہ ضرور کوئی نبی ہوں گے۔

حاشیہ ۲۹۴ "اس سوال کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بزرگ حیات بعد الموت کے منکر تھے یا نہیں اس میں شک تھا بلکہ وہ دراصل حقیقت کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے جیسا کہ انبیاء کو کرایا جاتا رہا ہے۔"

حاشیہ ۲۹۵ "ایک ایسے شخص کا زندہ پلٹ کر آنا جسے دنیا سو برس پہلے مردہ سمجھ چکی تھی خود اس کو اپنے ہمعصروں میں ایک جیتی جاگتی نشانی بنا دینے کے لئے کافی تھا" (تفہیم القرآن جلد اوّل صا ۲۰۰-۲۰۱)

ہم نے اس آیت کریمہ کے متن کو بار بار پڑھا ہے۔ اور ان حواشی کو بھی۔ ہم اپنے عجز کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ حواشی ہمیں اس آیت کے سمجھنے میں معاون نہیں ہو سکے۔ حاشیہ ۲۹۳ میں کہا گیا ہے کہ جن صاحب کا یہ ذکر ہے وہ ضرور کوئی نبی ہوں گے"، حاشیہ ۲۹۴ کہتا ہے "وہ حیات بعد الموت کے منکر (نہ) تھے ۔۔۔ بلکہ دراصل وہ حقیقت کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے جیسا کہ انبیاء کو کرایا جاتا رہا ہے" اور حاشیہ ۲۹۵ خود اس شخص کو جو ضرور کوئی نبی ہوں گے" اور "حقیقت کے عینی مشاہدہ" کے طلب گار بھی سو برس تک مردہ دوبارہ دنیا میں پلٹایا جانا بیان کرتا ہے تاکہ وہ "خود ۔۔۔ اپنے ہمعصروں میں ایک جیتی جاگتی نشانی بن جائے" ہمارے لئے یہ بات سمجھنا بہت ہی دشوار ہو رہا ہے کہ ایک شخص جو نبی اللہ ہو اور خدا تعالےٰ اس سے ہمکلام ہو رہا ہو۔ اس کو اس تجربۂ ہمکلامی کے بعد بھی کسی اور ثبوت کی کیا حاجت رہ جاتی ہو گی کہ وہ جانے کہ زندگی کی سرحد کے اس پار ایک اور دنیا بھی ہے جس کے لئے اسے حقیقت کے عینی مشاہدہ کی طلب کرنا پڑے جو حیات بعد الموت کا امر واقعہ ہونا دکھا سکے۔ وہ تو خود اس حقیقت عالیہ سے ذاتی طور پر متعارف ہوتا ہے جو تمام مخلوقات کی خالق ہے اسے اس کے مکالمہ مخاطبہ کے شرف کے بعد بھی حقیقت کے عینی مشاہدہ

کی احتیاج خود اس کے ذاتی تجربے کی حقیقت کے بارے میں صاحب تجربہ کے متشکک ہونے کا احتمال پیدا کر دیتی ہے مزید برآں سو برس ایک چھوٹی سی مدت بھی نہیں کہ اس میں مزور اس کے وہ ہمعصروں زندہ موجود ہوں جن کے سامنے سو برس پہلے وہ شخص یا تو مرگیا تھا یا دنیا اسے مردہ سمجھ چکی تھی تا وہ دوبارہ اپنے ہمعصروں میں ایک جیتی جاگتی نشانی بن جائے۔

مودودی صاحب نے جس سرسری طور سے اس واقعہ کی تفسیر میں تعین شخص تعین مکان کو ایک غیر ضروری بحث کہہ دیا ہے کیا واقعی یہ بات اتنی ہی غیر اہم اور غیر ضروری ہے۔

اگر ایسا ہے تو قرآن پاک کے طالب علم کے لئے اس واقعہ کا بیان معمہ بن جاتا ہے جس کی گرہیں اور بھی سخت ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ واقعہ جس مشکل کے حل کے لئے بطور دلیل بیان کیا جا رہا ہے خود وہ دلیل محل نزاع ہو کر ایک نیا عقدہ پیدا کر دیتی ہے جو حل ہی نہیں ہوتا کیونکہ اولاً تو کسی ایسے واقعہ کا ظہور انسانی تاریخ میں محفوظ نہیں اور مودودی صاحب کہہ چکے ہیں کہ اس کے تعین کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ دوسرے اگر یہ کسی الجھن کے سلجھاؤ کی کلید ہے تو یہ کلید شاید اس کے کام تو آسکتی جس نے ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوتے یا خود پر وارد ہوتے دیکھا ہو۔ دوسروں کے لئے تو یہ الجھن ہی رہے گی کیونکہ ایسا واقعہ ہر دور میں سو پچاس برس کے فاصلے سے انسانوں کے گروہوں کے سامنے ہوتا دیکھا یا سنا نہیں گیا کہ وہ حیات بعد الموت یا بعث ثانی پر نشانی ہو سکے۔

آپ اس گنجلک کو اس سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھیں جہاں قرآن پاک میں اسے رکھا گیا ہے۔ آیت اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ الخ ہے ۲۵۹ آیت زیر بحث ہے اور آیت ۲۶۰ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ذکر ابراہیم کی آیات ۲۵۸ اور ۲۶۰ کے درمیان اس آیت میں ایک واقعہ کا بیان یقیناً اس سیاق و سباق کی شخصیت تاریخ ان سے مترتب کسی اصول یا نتیجہ سے کوئی گہرا تعلق رکھتا ہوگا۔ جو اسے ان آیات کے درمیان بیان کیا گیا ہے۔ لیکن مودودی صاحب اس بارے میں ہماری کوئی امداد کر نہ پاتے اور یہ مقام تفسیر تفہیم القرآن میں ایک طالب علم کے لئے حل طلب ہی رہ گیا ہے۔ ویسے کسی واقعہ کا وقوع ہونا اعتقاداً مان لیا جا سکتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ واقعتاً اعتقادی مقام پر نہیں بلکہ دلیل پہ بیان کیا گیا ہے اور

دلیل کو اعتقاد کا ثبوت ہونا چاہیئے نہ کہ خود ایک نیا مفروضہ ہو سائل کو متحیر اور تشنہ چھوڑ جائے۔

رہا حدود اور احکامات کا معاملہ تو یہاں بھی مودودی صاحب نے کوئی نئی بات نہیں کہی بلکہ انہیں غلط قدموں کو راہ نما بنایا ہے۔ جو اس سے قبل بھی غلط استدلال کی خطوط پر اٹھائے گئے تھے۔

مثلاً زنا کی سزا کے بارے میں قرآن پاک کے واضح حکم کے باوجود وہ شادی شدہ مرد اور عورت کی سنگساری کو شرعاً واجب العمل سمجھتے ہیں حالانکہ ایسی کسی سزا کا حکم قرآن پاک میں نہیں۔ اور چونکہ انہیں ایسا حکم قرآن پاک میں نہیں ملا انہوں نے اسے بعض احادیث میں بیان کردہ واقعات سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن احادیث میں بیان کردہ واقعات کے بارے میں یہ ثابت نہیں ہے کہ جو سزائیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے سنگساری کی بعض مرتکبین کو دیں وہ سورۃ النور کی آیات جَلْدَۃٌ کے نزول سے پہلے کی ہیں یا بعد کی۔ پھر جس مقدمہ کو سب سے بڑا مقدمہ ماعز بن مالک اسلمیؓ کا کہکر مودودی صاحب نے بطور نظیر پیش کیا ہے۔ اس کے بارے میں مودودی صاحب نے خود لکھا ہے کہ:-

"جب پتھر پڑنے شروع ہوئے تو ماعز بھاگا اور اس نے کہا لوگو مجھے رسول اللہ کے پاس لے چلو میرے قبیلے کے لوگوں نے مجھے مروا دیا انہوں نے مجھے دھوکا دیا کہ رسول اللہ مجھے قتل نہیں کروائیں گے مگر مارنے والوں نے اسے مار ڈالا۔ بعد میں جب حضور کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا تم لوگوں نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا میرے پاس لے آئے ہوتے شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ تعالےٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا"۔ (تفہیم القرآن جلد سوم صہ ۳۲۶)

مودودی صاحب کو اصرار ہے کہ شادی شدہ زانی واجب رجم ہے اور اوپر بیان کردہ واقعہ اس کا سب سے بڑا ثبوت اور نظیر (PRECEDENT) ہے جو نبویؐ عدالت سے فیصلہ کی صورت میں صادر ہوا۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے مودودی صاحب نے سورۃ النساء آیت ۱۶ پر جو تفسیری حاشیہ لکھا تھا وہ یہ ہے:-

"ان دونوں آیتوں (یعنی ۱۵-۱۶) میں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت صرف زانیہ عورتوں کے متعلق ہے اور ان کی سزا یہ ارشاد ہوئی ہے کہ انہیں تاحکم ثانی قید رکھا جائے۔ دوسری آیت زانی مرد

اور زانیہ عورت دونوں کے بارے میں ہے کہ دونوں کو اذیت دی جائے یعنی مارا پیٹا جائے سخت سست کہا جائے اور ان کی تذلیل کی جائے زنا کے متعلق یہ ابتدائی حکم تھا۔ بعد میں سورہ نور کی یہ آیت نازل ہوئی جس میں مرد اور عورت دونوں کے لئے ایک ہی حکم دیا گیا کہ انہیں سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ اہل عرب چونکہ اس وقت تک کسی باقاعدہ حکومت کے تحت رہنے اور عدالت و قانون کے نظام کی اطاعت کرنے کے عادی نہ تھے اس لئے یہ بات حکومت کے خلاف ہوئی اگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی ایک قانون تعزیرات بنا کر دفعۃً ان پر نافذ کر دیا جاتا اللہ تعالے نے ان کو رفتہ رفتہ تعزیری قوانین کا خوگر بنانے کے لئے پہلے زنا کے متعلق یہ سزائیں تجویز فرمائیں پھر بتدریج زنا۔ قذف۔ اور سرقہ کی حدیں مقرر کیں اور بالآخر اسی بنا پر تعزیرات کا وہ مفصل قانون بنا جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت میں نافذ تھا"۔ (تفہیم القرآن جلد اول ص۳۳۱)

سورۃ النساء کا مندرجہ بالا حاشیہ اس باب میں سزاؤں کے قوانین کے تدریجی نفاذ کی حکمت بیان کرتا ہے۔ اسی طرح کا تفصیلی حاشیہ سورۃ النور میں بھی ہے جس میں سے ایک مختصر حصہ ہم نقل کرتے ہیں:۔

(۵) "زنا کو قابل سزا فعل تو ۳ھ میں ہی قرار دے دیا گیا تھا لیکن اس وقت یہ ایک عام۔ قانونی جرم نہ تھا جس پر ریاست کی پولیس اور عدالت کوئی کارروائی کرے بلکہ اس کی حیثیت ایک معاشرتی یا خاندانی جرم کی تھی جس پر اہل خاندان ہی کو بطور خود سزا دے لینے کا اختیار تھا۔ حکم یہ تھا کہ اگر چار گواہ اس امر کی شہادت دے دیں کہ انہوں نے ایک مرد اور ایک عورت کو زنا کرتے دیکھا ہے تو دونوں کو مارا پیٹا جائے اور عورت کو گھر میں قید کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ اشارہ بھی کر دیا گیا تھا کہ یہ قاعدہ "تا حکم ثانی" ہے اصل قانون بعد میں آنے والا ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول ص۳۳۱)

اس کے ڈھائی تین سال بعد یہ حکم نازل ہوا جو آپ اس آیت میں پا رہے ہیں اور اس نے حکم سابق کو منسوخ کر کے زنا کو ایک قانونی جرم قابل دست اندازی سرکار (cognizable offence) قرار دے دیا"۔ (تفہیم القرآن جلد سوم ص۳۲۵)

گویا یہ حکم ۶ھ میں نازل ہوا اور اس نے بقول مودودی صاحب پچھلے حکم کو جو ۳ھ میں

نازل ہوا تھا منسوخ کر دیا حالانکہ یہ غلط ہے کہ قرآن پاک نے یہ کہا ہے کہ اصل قانون بعد میں آنے والا ہے آیت تو صرف یہ کہتی ہے کہ "یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا اللہ تعالٰے ان کے لئے راستہ نکال دے" راستہ نکالنے کا مطلب مفسرین نے شادی ہو جانا یا امر اللہ ہو جانا لکھا ہے نہ کہ کسی دوسرے حکم کا انتظار مودودی صاحب نے سورہ نور کو "۶ھ" کے نصف آخر میں سورہ احزاب کے کئی مہینے بعد نازل ہونا بیان فرمایا ہے۔ (تفہیم القرآن جلد سوم صـ۳۰۰)

اس وقت کی اسلامی ریاست کی حالت یہ تھی:۔

جنگ" خندق میں یہ لوگ متحد ہو کر دس ہزار فوج کے ساتھ مدینے پر چڑھ آئے تھے مگر ایک مہینے تک سر مارنے کے بعد آخر کار ناکام ہو کر چلے گئے اور ان کے جاتے ہی نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے علی الاعلان فرما دیا لَنْ تَغْزُوكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُونَهُمْ (ابن ہشام جلد ۳ صـ۲۶۶) اس سال کے بعد قریش تم پر چڑھائی نہیں کریں گے بلکہ تم ان پر چڑھائی کرو گے"۔ (ایضاً صـ۳۰۷)

یعنی اب اسلامی ریاست مضبوط تھی۔ ابتدائی دور جس میں نفسیات فرد اور اجتماع کا تقاضا تھا کہ تعزیر ملکی ہو اور فعل زیر بحث کو خاندانی اور معاشرتی جرم ہی رکھا جائے قابل دست اندازی سرکار نہ بنایا جائے۔ وہ دور گذر چکا تھا۔ مودودی صاحب کی تفسیر کے مطابق سورۃ النسأ والا حکم منسوخ ہو کر سورۃ النور والا حکم آچکا تھا۔ اس سب صورت حال کو دھیان میں رکھ کر اب اس عظیم شخصیت کے جملوں کو پڑھیئے جس پر قرآن کے احکامات وحی ہو رہے تھے اور جو اوّل المؤمنین ہونے کی حیثیت میں انہیں نافذ کرنے کا پابند تھا کہ:۔

"تم لوگوں نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا۔ میرے پاس لے آئے ہوتے شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا"

کیا یہ لفظ اس شخص کے ہو سکتے ہیں جو رجم کو شادی شدہ زانی کے لئے شرعی سزا سمجھتا ہو اور خود حاکم وقت اور مہبط وحی ہونے کے سبب اس کے نافذ کرنے کا پابند ہو؟ کیا اس سے یہ غالب تاثر نہیں ملتا کہ یہ واقعہ سورہ نور میں آیت جلد نازل ہونے سے پہلے کا ہوگا ورنہ توبہ کا اب کیا مقام تھا۔

اور قبولیت کا کیا سوال جب کہ مجرم پر ارتکاب جرم میں حد کا جاری کرنا ہی منشائے شریعت الٰہی ٹھہرا۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ ایسے خیالات کا اظہار بھی فرما سکتے تھے جب حضور سمجھتے تھے کہ اللہ تعالےٰ کا منشاء سنگساری نہیں کیونکہ اگر آیات جلد آجانے کے بعد جب جرم قابل دست اندازی سرکار ہو چکا تھا سنگساری ہی ایسے مجرموں کی سزا تھی تو حضور ایسا نہ کہہ سکتے تھے اور اگر قبل از نزول آیات جلد حضورؐ نے ایسا فرمایا تو حضور سمجھتے تھے کہ سنگساری حکم الٰہی نہیں اس لئے اس میں رد و بدل یا کمی بیشی کی جا سکتی تھی۔ مودودی صاحب نے اس بحث پر صفحوں کے صفحے بھر دیئے ہیں۔ لیکن یہ بات ان کی نظروں سے شاید اوجھل رہ گئی ہے۔ ورنہ حضور سے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ سنگساری کو شرعی سزا بھی سمجھیں اور پھر اس سے بھاگنے والے کو چھوڑ دینے کی ترغیب یہ کہہ کر لوگوں کو دلوائیں کہ شاید وہ توبہ کرتا اور توبہ قبول ہوتی۔ یہ کہنا کہ اس سزا کو گذشتہ سینکڑوں برس سے ایسے ہی تسلیم کرتی چلی آرہی ہے۔ کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ قرآن پاک کے علی الرغم کوئی رسم اگر رواج پا جائے تو وہ قرآن پاک کی آیات کا سا حکم نہیں رکھ سکتی۔ آخر ایک مدت طویل تک اسی امت میں غلامی کا رواج بھی تو رہا ہے کیا اسے بھی اجماع امت تصور کیا جا سکتا ہے؟ یا اسے قرآن پاک کا حکم مانا جا سکتا ہے! رہا حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ قرآن پاک میں شاید کوئی اس قسم کی آیت تھی جواب نہیں ہے۔ لیکن حکم باقی ہے بہت ہی کمزور دلیل ہے کیونکہ باوجود اس کے مودودی صاحب سورۃ النساء کے احکامات کو منسوخ مانتے ہیں پھر بھی وہ آیات آج تک قرآن پاک میں لکھی چلی آرہی ہیں اور تلاوت کی جاتی ہیں تو حضرت عمرؓ سے منسوبہ روایت کی آیات ہی کو کیوں نہ قرآن پاک میں رہنے دیا گیا۔ کیا یہ عجیب نہیں کہ ایک آیت منسوخ العمل قرآن پاک میں ہو اور ایک آیت جو واجب العمل ہے وہ موجود نہ ہو۔ پھر ایک ایسا خیال قرآن پاک میں تحریف تسلیم کرنا ہے جو درست نہیں۔

مودودی صاحب کہتے ہیں کہ بجز خوارج اور معتزلہ کے کسی نے بھی امت کی پوری تاریخ میں اس سے انکار نہیں کیا اور ان کے انکار کی بنیاد بھی بقول مودودی صاحب کے یہ نہیں تھی کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے اس حکم کے ثبوت میں وہ کسی کمزوری کی نشان دہی کر سکے بلکہ وہ اسے قرآن شریف کے خلاف قرار دیتے تھے۔

"حالانکہ یہ ان کے فہم کا قصور تھا۔ وہ کہتے تھے کہ قرآن الزانی والزانیہ کے مطلق الفاظ استعمال

کر کے اس کی سزا سو کوڑے بیان کرتا ہے لہذا قرآن کی رو سے ہر قسم کے زانی اور زانیہ کی سزا یہی ہے اور اس سے زانی محصن کو الگ کر کے اس کی کوئی سزا تجویز کرنا قانون خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔"

مودودی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں "اَلسَّارِقُ وَ السَّارِقَۃُ" کا حکم بھی قطع ید بیان ہوا ہے اور اگر ان کو تشریحات نبوی سے مقید نہ کیا جائے تو ایک پیسہ کی چوری پہ بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور لاکھوں کی چوری والا بھی اگر گرفتار ہونے ہی توبہ کر لے تو اسے چھوڑنا ہو گا کیونکہ قرآن کہتا ہے فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِہٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوْبُ عَلَیْہِ ط (مائدہ ۵ - ۳۹) اسی طرح رضاعی ماں اور رضاعی بہن کی حرمت بھی صرف قرآن میں بیان کی گئی ہے ۔ رضاعی بیٹی کی حرمت اس استدلال سے قرآن کے خلاف ہونی چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے جو بات کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت العمل ہو وہ قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتی۔

اولاً تو مودودی صاحب کی باتوں سے خود ثابت ہے کہ اَلسَّارِقُ وَ السَّارِقَۃُ والے حکم میں انتہائی صورت قطع ید ہو سکتی ہے اور حضور نے جو تشریحات کیں وہ اس کم تر حالت ہی کی تھیں۔ اب اگر اَلزَّانِیْ وَالزَّانِیَۃُ کی انتہائی سزا رجم درج ہوتی تو تشریحات اس کی کم تر صورتوں کی نشان دہی کرتیں۔ جب ایک صریح سزا درج ہے تو اس سے زیادہ سزا کا تصور قرآن پر اضافہ ہے۔ رہا یہ کہ حضورؐ نے ایسا کیا تھا۔ تو ہم اسکی وضاحت کر چکے ہیں کہ اس کا بعد نزول آیات جلد واقعہ ہونا ثابت نہیں لہذا ہم قرآن کی صریح آیات کے خلاف حضور کا عمل کرنا تصور میں بھی نہیں لا سکتے۔

دوسرے یہ تو ثابت ہے کہ لونڈی اگر نکاح کے بعد ارتکاب زنا کرے تو اس کے لئے محصنہ عورت سے نصف سزا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں مذکور ہے کہ:۔

"فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیْہِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ" (سورۃ النساء ۴:۲۵)

یعنی جب وہ حصار نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد کسی بد چلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو خاندانی عورتوں (محصنات) کے لئے مقرر ہے (ترجمہ اردو مودودی صاحب)

مودودی صاحب نے اس پر لکھا ہے :۔

"سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیچیدگی واقع ہوتی ہے جس سے خوارج اور ان دوسرے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے جو رجم کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر آزادی شادی شدہ عورت کے لئے اسلام میں زنا کی سزا رجم ہے تو اس کی نصف سزا کیا ہو سکتی ہے جو لونڈی کو دی جائے لہٰذا یہ آیت اس بات پر دلیل قاطع ہے کہ اسلام میں رجم کی سزا ہے ہی نہیں۔ لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر غور نہیں کیا اس رکوع میں لفظ مُحْصَنٰتٌ دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک شادی شدہ عورتیں۔ جنہیں شوہر کی حفاظت حاصل ہو۔ دوسرے خاندانی عورتیں جن کو خاندان کی حفاظت حاصل ہو اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ آیت زیر بحث میں محصنات کا لفظ لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے لئے دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ پہلے معنی میں جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے بخلاف اس کے لونڈیوں کے لئے محصنات کا لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ جب انہیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے تب ان کے لئے زنا کے ارتکاب پر وہ سزا ہے جو مذکور ہوئی۔ اب اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں، ایک خاندان کی حفاظت جس کی بناء پر وہ شادی کے بغیر بھی محصنہ ہوتی ہے دوسری شوہر کی حفاظت جس کی وجہ سے اس کے لئے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے بخلاف اس کے لونڈی جب تک لونڈی ہے محصنہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے البتہ نکاح ہونے پر اس کو صرف شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی ادھوری کیونکہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے جن کی وہ ملک میں تھی اور نہ اسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو خاندانی عورت کو نصیب ہوا کرتا ہے لہٰذا اسے جو سزا دی جائے گی وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی نہ کہ شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ سورۃ النور کی دوسری آیت میں زنا کی جس سزا کا ذکر ہے وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لئے ہے۔

جن کے مقابلہ میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے۔ ایسی شادی شدہ خاندانی عورتیں تو وہ غیر شادی شدہ محصنات سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں کیونکہ وہ دوسری حفاظت کو توڑتی ہیں اگرچہ قرآن ان کے لئے سزائے رجم کی تصریح نہیں کرتا۔ لیکن نہایت لطیف طریقہ سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بلید الذہن لوگوں سے مخفی رہ جائے تو رہ جائے لیکن نبی کے ذہن رسا سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا

(تفہیم القرآن جلد اوّل ۳۴۴ - صفحہ ۳۴۴)

ہم نے یہ طویل اقتباس اس لئے نقل کیا ہے تاکہ مودودی صاحب کی دلیل انہی کے لفظوں میں واضح ہو جائے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی آڑ لے کر انہوں نے جو اپنے سے اختلاف کرنے والوں کو بلید الذہن کہا ہے یہ طریق تکلم کوئی قابل تعریف چیز نہیں جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ حضور سے منسوب واقعہ کی اپنی نوعیت ہی حتمی اور قطعی طور پر ثابت نہیں نہ خود حضورؐ نے اس سزا کو قابل ستائش سزا سمجھا - اور جو لوگ کہ رجم کو قرآن کا حکم نہیں مانتے وہ اس بات کو بھی نہیں مانتے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے آیات جلد نازل ہونے کے بعد بھی رجم کی سزا دی - اس لئے مودودی صاحب کو ان لوگوں کے لئے بلید الذہنی کا خطاب نازشنا بری بات تھی - اب ذرا اس دلیل کو دیکھئے جو انہوں نے لونڈیوں کی نصف سزا کو متعین کرنے کے لئے دی ہے - وہ کہتے ہیں کہ آزاد عورت کی شادی کے بعد وہ حفاظتیں ہوتی ہیں لونڈی کی ایک وہ بھی ادھوری - اوّلاً تو یہ استدلال ہی غلط ہے - لونڈی جس کی ملک ہوتی ہے اس کی حفاظت میں ہی ہوتی ہے - جبھی آیت زیر بحث میں :-

فَانْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ (۴ : 25) کے الفاظ ہیں - مالک کی اجازت کے بغیر لونڈی کا نکاح نہیں ہو سکتا ہے - دوسرے یہ احکامات سورۃ النساء کے ہیں - مودودی صاحب کہتے ہیں کہ سورۃ نور کے احکام آجانے کے بعد سورۃ النساء کے وہ احکامات جو زانیہ عورتوں اور زانی مردوں کی سزا کے بارے میں تھے منسوخ ہو گئے - سوال یہ ہے کہ لونڈیوں کے بارے میں جو احکامات سورۃ النساء میں ہیں کیا وہ منسوخ ہوئے یا علیٰ حالہٖ قائم رہے ہمارا خیال ہے کہ مودودی صاحب ان کے علیٰ حالہٖ قائم رہنے کو تسلیم کرتے ہیں - تبھی تو وہ کہتے ہیں کہ :-

نیز یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ سورہ نور کی دوسری آیت میں زنا کی جس سزا کا ذکر ہے وہ صرف غیر شادی شدہ عورتوں کے لئے ہے - جن کے مقابلہ میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے ''

تو گذارش ہے کہ سورہ نور کی دوسری آیت نازل ہونے سے پہلے لونڈیوں کے لئے نصف سزا کا تعین کس طریق سے کیا جاتا تھا؟ تیسرے یہ کہ اگر یہ سزا شادی شدہ لونڈی کی غیر شادی شدہ آزاد عورت کے مقابل ہے تو غیر شادی شدہ لونڈی پر کوئی گرفت ہو ہی نہیں سکتی - وہ جو چاہے کرتی پھرے - حالانکہ

یہ درست نہیں ۔ قرآن کا قطعی حکم ہے کہ وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اور اس حکم کے آنے پر ہی حضورؐ نے فرمایا تھا کہ لا مساعاۃ فی الاسلام (تفہیم القرآن جلد سوم ص۳۴۸)

لہٰذا مودودی صاحب کا یہ استدلال کہ غیر شادی شدہ عورت کی سزا کا نصف شادی شدہ لونڈی کی سزا ہے درست نہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ (نساء ۴ : ۲۵) فی الحقیقت اس تفریق کو مٹایا ہے ہاں غلام عورتوں کی سزا کو نصف اس لئے کہا ہے کہ جس طبقہ سے وہ تعلق رکھتی ہیں ان سے اخلاقی حس کی اس بلندی کی عام توقع نہیں کی جا سکتی جس قدر کہ آزاد عورتوں سے اخلاقی احساس کی شدت اور بلندی متوقع تھی ۔ ایک ایسا طریق فکر خود اس بات کا ترجمان ہے کہ قرآن پاک مخصوص معاشرتی ماحول اور ذہنی پختگی یا بلندی کا کس قدر خیال رکھتا ہے ۔

مودودی صاحب جس قسم کے تصور ریاست کے قائل ہیں اس میں فرد اور اجتماع کے حقوق و فرائض کے جو حدود انہوں نے متعین کئے ہیں ان میں ابھی بیشتر مقامات ازمنہ قدیمہ کے سخت گیر شاہانہ اور جاگیر دارانہ طریقہائے نظام حکمرانی کی جھلک نظر آتی یا موجودہ دور کی آمرانہ فسطائیانہ یا کلی حاکمیت اور سماج کا پرتو دکھائی دیا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے لئے روائتی لباس اسلام ہی کے نام پر تیار کیا گیا ہے ۔ ہماری اس تحریر کو کسی تعصب یا تنگ نظری پر محمول نہ کیا جائے کیونکہ ہمارا اختلاف کسی ذاتی وجہ سے نہیں ۔ مودودی صاحب خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان مجوزہ ریاست میں ضمیر کے تقاضے کے تحت تبدیلی مذہب قابل دست اندازی سرکار جرم ہوگا جو ارتداد کہلاتا ہے اور مرتد کی سزا ان کے نزدیک قتل ہے اس پر انہوں نے ایک مستقل رسالہ بعنوان "مرتد کی سزا" بھی لکھا ہے ۔ ان کے نزدیک اگر کسی نے محض اپنے ضمیر کے تقاضے کے تحت مذہب تبدیل کر لیا ہو اس کے ساتھ اس نے چاہے بغاوت نہ کی ہو نہ کسی کو قتل کیا ہو نہ ہی کسی دوسرے شخص کو ترغیب بغاوت دی ہو ۔ محض تبدیلی مذہب اسے پھانسی کے پھندے یا سنگساری کے میدان میں پہنچا سکتا ہے ۔ مودودی صاحب کی طرح سوچنے والے اشخاص اس حکم کی سند قرآن پاک سے کبھی بھی نہیں لا سکے بلکہ ہمیشہ بعض ایسے واقعات یا احادیث کا سہارا لیتے رہے ہیں جو کسی خاص صورت حال سے متعلق تھیں اور اسے عام حکم میں بدل کر قانون بنا ڈالتے رہے ہیں لیکن ان سب کو اس استدلال کی کمزوری کا احساس تھا اور صحیح تو یہ ہے کہ ارتداد کا ذکر بارہا قرآن پاک میں آیا ہے لیکن کہیں بھی اس کی سزا کے قتل کا ذکر نہیں بلکہ

ایسے شخص کے اعمال ضائع ہو جانے اور آخرت میں خائب وخاسر ہونے ہی کی وعید سنائی گئی ۔ ان تمام صریح اور واضح آیات کے علی الرغم مودودی صاحب نے اپنے مسلک کی حمایت میں ایک آیت درج فرمادی ہے حالانکہ وہ مرتدین کے بارے میں ہے ہی نہیں اسے زبردستی مرتدین پر جڑ دینا ہمیں عجیب لگا ۔ وہ آیت سورہ توبہ کی وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ہے ۔ (توبہ ۹: ۱۲)

مودودی صاحب نے اس کا ترجمہ لکھا ہے :۔

اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنے قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر حملے شروع کر دیں تو کفر کے علم برداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں شاید کہ پھر تلوار ہی کے زور سے وہ باز آجائیں گے ۔

اس پر حاشیہ لکھا ہے :۔

"اس جگہ سیاق وسباق خود بتا رہا ہے کہ قسم اور عہد وپیمان سے مراد کفر چھوڑ کر اسلام قبول کر لینے کا عہد ہے اس لئے کہ ان لوگوں سے اب کوئی معاہدہ کرنے کا تو کوئی سوال باقی ہی نہ رہا تھا ۔ پچھلے سارے معاہدے وہ توڑ چکے تھے ان کی عہد شکنیوں کی بنا پر ہی اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے برأت کا انہیں صاف صاف سنایا جا چکا تھا ۔ یہ بھی فرما دیا گیا تھا کہ آخر ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی معاہدہ کیسے کیا جا سکتا ہے اور یہ فرمان بھی صادر ہو چکا تھا کہ اب انہیں صرف اسی صورت میں چھوڑا جا سکتا ہے کہ یہ کفر وشرک سے توبہ کر کے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی پابندی قبول کر لیں ۔ اس لئے یہ آیت مرتدین سے جنگ کے معاملہ میں بالکل صریح ہے "۔

(تفہیم القرآن جلد دوم ص۱۷۹)

اولاً تو یہ آیت بالصراحت ارتداد سے متعلق ہے ہی نہیں ، صحابہ کرامؓ وجملہ مفسرین نے اس آیت سے بالاتفاق کفار کی عہد شکنی مراد لی ہے اور حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ اس آیت میں مذکورہ کفار سے جنگ ہوئی ہی نہیں ۔ ثانیاً اگر بالفرض اس سے مرتد بھی مراد لے لئے جائیں تو اس میں ارتداد محض کی حالت کا ذکر نہیں بلکہ ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں ۔ اب دین پر حملوں کی ایک نوعیت تو وہ تھی جو عہد نبوی میں پائی جاتی تھی اس وقت یلغار نیزوں اور تلواروں اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کی

آگ بھڑکانا ہوتا تھا اور ظاہر ہے کہ جوابی کارروائی بھی اس نوعیت کی کرنا لازم ہو جاتی تھی اور آج دین پر حملے غلط دلائل۔ علم کج۔ اور جھوٹے پروپیگنڈے کی شکل میں ہوتے ہیں تو جواباً مضبوط دلائل صحیح علم اور تبیان حق سے ہی دین کا دفاع ہو سکتا ہے اور ایسے کفار کے خلاف علمی جنگ برپا کی جا سکتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ کارروائی حسب ضرورت وافتی ہے جو مشروط ہے۔ مودودی صاحب نے اسے مطلق اور غیر مشروط کہاں سے بنالیا ہے۔

ایک طرف تو یہ شدت ہے کہ مودودی صاحب مرتدین کو واجب القتل سمجھتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ مرتدین ان کے نزدیک وہ لوگ ہوں گے جو اسلام کا اعلانیہ انکار کر دیں پھر خود ہی اپنے محدود دائرے میں سمٹ آتے ہیں کہ قرآن کے ماننے والوں کو بھی "اہل کتاب" کہہ کر پکارنے لگتے ہیں:۔

"اس کی نظریں قرآن کو ماننے والے اہل کتاب میں بھی مفقود نہیں"۔ (تفہیم القرآن جلد اول ص۲۶)

اور کبھی انہیں اور غیر مسلموں کو ایک ہی سمجھ لیتے ہیں:۔

"خدا سے آزاد ہو کر کام کرنا اور اپنے نفس و متعلقات نفس کے بارے میں خود یہ فیصلہ کرنا کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں بہر حال ایک کافرانہ رویہ زندگی ہے، خواہ اس پر چلنے والے لوگ "مسلمان" کے نام سے موسوم ہوں یا غیر مسلم کے نام سے"۔ (تفہیم القرآن جلد دوم ص۲۳)

اور کبھی اتنی وسعت کا اظہار کرتے ہیں کہ اسلام کے ظاہری حدود اربعہ کو بھی اہمیت نہیں دیتے:۔

اسلام صرف اس دین کا نام نہیں جسے محمد صلے اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں اور مسلم کی اصطلاح کا اطلاق محض حضورؐ کے پیرؤوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے تمام انبیاءؑ کا یہی دین اسلام تھا اور ہر زمانہ میں ان سب کے پیرو مسلمان ہی تھے .... تعجب ہے کہ بعض بڑے بڑے اہل علم بھی اس حقیقت کے ادراک سے عاجز رہ گئے ہیں حتیٰ کہ اس صریح آیت کو دیکھ کر بھی ان کا اطمینان نہ ہوا۔ علامہ سیوطیؒ نے ایک مفصل رسالہ اس موضوع پر لکھا کہ مسلم کی اصطلاح صرف امتِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے مختص ہے

(تفہیم القرآن جلد سوم ص۲۴۳)

کبھی خود ہی کہتے ہیں کہ:۔

"بندوں کے لئے ایمان بس ایک ہی اقرار و تصدیق ہے جس سے ہر مسلمان داخل اسلام ہوتا ہے

اور جب تک اس پر قائم رہے مسلمان مانا جاتا ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ آدھا مسلمان ہے اور یہ پاؤ یا یہ دوگنا مسلمان ہے اور یہ تین گنا ہے اس طرح قانون حقوق میں سب مسلمان یکساں ہیں :۔

(تفہیم القرآن جلد چہارم ص۸۳)

یا فرماتے ہیں:۔

"دُنیا میں جس فقہی قانون پر اسلامی سوسائٹی بنتی ہے اس کی رو سے تو ایمان چند عقائد کے اقرار کا نام ہے جس کے بعد کوئی قاضی شرع کسی کے غیر مؤمن یا خارج از ملت ہونے کا حکم نہیں لگا سکتا"، (تفہیم القرآن جلد دوم ص۲۴۳)

نہ صرف یہ بلکہ ایک مرتبہ کلمہ شہادت پڑھ لینا ہی فرض ہے :۔

"امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور جمہور علماء کا یہ مسلک ہے کہ درود عمر میں ایک مرتبہ پڑھنا فرض ہے یہ کلمہ شہادت کی طرح ہے کہ جس نے ایک مرتبہ اللہ تعالےٰ کی الوہیت اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کر لیا اس نے فرض ادا کر دیا۔ اسی طرح جس نے ایک دفعہ درود پڑھ لیا وہ فریضہ صلوٰۃ علی النبیؐ سے سبکدوش ہو گیا اور اس کے بعد نہ کلمہ پڑھنا فرض ہے نہ درود"، (تفہیم القرآن جلد چہارم ص۱۲۷)

لیکن عمل میں مودودی صاحب نے ایک کلمہ گو گروہ کو خارج از اسلام قرار دلوانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا یا اور اس کی تکفیر سرکار دربار سے کر دا کر اب بھی دم نہیں لیا اور نہ جانے اور کیا کیا کروانے کی تمنائیں ابھی ان کے خیال انگیز ذہن میں گردش کر رہی ہیں۔ مودودی صاحب نے ایک تفسیری حاشیہ یوں لکھا تھا کہ:۔

"جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ ماہ حرام میں لڑنا بری بات ہے ۔ مگر اس پر اعتراض کرنا ان لوگوں کو زیب نہیں دیتا جنہوں نے ۱۳ برس مسلسل اپنے سینکڑوں بھائیوں پر صرف اس لئے ظلم توڑے کہ وہ ایک خدا پر ایمان لائے تھے ۔ پھر ان کو یہاں تک تنگ کیا کہ وہ جلا وطن ہونے پر مجبور ہو گئے پھر اس پر بھی اکتفا نہ کیا اور اپنے ان بھائیوں کے لئے مسجد حرام تک جانے کا راستہ بھی بند کر دیا۔ حالانکہ مسجد حرام کسی کی ملک نہیں ہے اور پچھلے دو ہزار برس میں کبھی ایسا نہ ہوا کہ کسی کو اس کی زیارت سے روکا گیا ہو"

(تفہیم القرآن جلد اول ص۱۶۵)

تعجب ہے کہ کیا یہ مودودی صاحب کی تحریر ہے ۔ جب ان کے نزدیک وہ مشرک جو اس وقت مکہ شریف میں حرم پر قابض تھے اور یہ قدرت رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو مسجد حرام میں آنے سے روک دیں

مسلمانوں کے "بھائی" ہی شمار ہوتے ہیں اور مودودی صاحب بطور دلیل و حجت انہیں اس ناطے سے ملزم کر رہے ہیں تو ان احمدیوں کے بارے میں مودودی صاحب کا دل کیوں اس قدر سخت ہو گیا ہے جن کا ان سے ہر ہر باب میں اعتقاداً اور عملاً اتفاق ہے پھر بھی وہ انہیں حرم شریف میں جانے اور زیارت مرقد نبوی سے روکنے کی سعی فرماتے رہے ہیں اور انہوں نے اپنے حامیوں سے منوا کر دم لیا ہے کہ احمدیوں کو حج بیت اللہ شریف سے روک دیا جائے وہ ہی کہیں کہ ایسا کرنے سے وہ اپنی ہی تعبیر کی روشنی میں کس گروہ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں؟ وہ اس کے جو چاہیں وجوہات جوازیہ بیان کریں ان کا دل ان کو ہمیشہ ملزم گردانے گا کہ ان کے پاس کوئی ظاہر اور بین وجہ احمدیوں کو حج بیت اللہ شریف سے روکنے اور کافر قرار دینے کی نہیں کہاں ان کا وہ دعوٰی کہ مسیح کے دوبارہ آنے پر مسئلہ کفر و اسلام پیدا ہی نہیں ہو گا اور کہاں ان کا یہ فعل کہ خود مسیح موعود کو ہی کافر اور ان کے ماننے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دلوائیں شاید وہ اس کو "توریہ" کی قسم کا کوئی تکنیکی فعل کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیں اور حقیقت پر پردہ ڈالنا کہہ لیں اپنے نزدیک مصلحت بالاتر کے لئے اسے شرعاً جائز سمجھ لیں لیکن ان کا دل اس سے کبھی مطمئن نہ ہو سکے گا کیونکہ یہ تضاد انہیں ہمیشہ خلش پیدا کرتا رہے گا

ایک طرف تو انہوں نے اس سوال کا ذکر کیا ہے جو :-

"بالعموم لوگوں کے ذہن میں کھٹکتا ہے ـــــ کہ ایک طرف تو قرآن ان لوگوں کی انتہائی مذمت کرتا ہے جو کتاب اللہ کے آجانے کے بعد تفرقے اور اختلافات میں پڑ جاتے ہیں اور اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں دوسری طرف قرآن کے احکام کی تعبیر و تفسیر میں صرف متاخرین ہی نہیں آئمہ اور تابعین خود صحابہؓ کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں کہ شاید کوئی ایک بھی آیت ایسی نہ ملے گی جس کی ایک تفسیر بالکل متفق علیہ ہو۔"

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اختلاف کی دو صورتیں ہیں ایک محمود ہے اور ایک مغضوب ہے۔ محمود صورت :-

"تو وہ ہے جس میں خدا اور رسول کی اطاعت پر جماعت کے سب لوگ متفق ہوں احکام کے ماخذ بھی بالاتفاق قرآن اور سنت کو مانا جائے اور پھر دو عالم کسی جزدی مسئلہ کی تحقیق میں یا دو قاضی کسی مقدمے کے فیصلے میں ایک دوسرے سے اختلاف کریں۔ مگر ان میں سے کوئی بھی نہ تو اس مسئلے کو مدار دین بنائے

اور نہ اس سے اختلاف کرنے والے کو دین سے خارج قرار دے بلکہ دونوں اپنے اپنے دلائل دے کر اپنی علم تک تحقیق کا حق ادا کر دیں اور یہ بات رائے عامہ پر یا اگر عدالتی مسئلہ ہو تو ملک کی آخری عدالت پر یا اگر اجتماعی معاملہ ہو تو نظام جماعت پر چھوڑ دیں کہ وہ دونوں رائیوں میں سے جس کو چاہیں قبول کریں یا دونوں کو جائز رکھیں"۔ (تفہیم القرآن جلد اوّل ص۳۵)

دوسری طرف ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے ایک پورے کلمہ گو گروہ کو جو خدا اور رسولؐ کی اطاعت پر جماعت سے متفق ہے اور احکام کا ماخذ بھی بالاتفاق قرآن اور سنت ہی کو تسلیم کرتا ہے دین سے خارج قرار دلوانے کے لیے بہت بڑے ہنگامے کی سربراہی قبول کی اور حکومت وقت پر زور دیا کہ ان لوگوں کو کافر قرار دے دیا جائے کیونکہ وہ مودودی صاحب یا بعض مولویوں کی تفسیر بعض آیات قرآنی کی درست نہیں سمجھتے تھے۔ چلیں اگر اس گروہ سے ان کے اختلافات کی نوعیت بعض مصلحتوں کے سبب مجبوریوں کی پابند ہے تعجب ہے کہ دوسرے ایسے لوگ بھی جا ہے وہ مسلم تھے یا غیر مسلم جنہیں مودودی صاحب کے نکتۂ نظر سے اختلاف ہے ان کے بارے میں بھی تفہیم القرآن کے بیشتر مقامات پر مودودی صاحب کا قلم تلخ ہو گیا ہے اور اس نے اس حد کا احترام ملحوظ نہیں رکھا جن کا خود مودودی صاحب نے ہی قائم رکھا عفت قلم و نظر کے لیے ضروری قرار دیا تھا۔

مثلاً خدا اور خلق سے تعلق کو سمجھانے کے لیے قرآن پاک نے انسانی زبان میں مستعمل مصطلحات کو استعمال کیا ہے بعض غیر مسلموں یا موجودہ دور کے بعض ترقی پسندوں نے اس پر اعتراض کیا۔ ان کا مودودی صاحب "کم فہم ناقدین کے معکوس دماغوں" کے الفاظ میں ذکر کرتے ہیں پھر انہیں "ظالم" کہتے ہیں: (تفہیم القرآن جلد دوم ص۳۷)

پھر کفار کے سلسلہ میں حضرت نوحؑ کی دعا کا ذکر کر کے کہتے ہیں "ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا بدکار۔ اور نمک حرام ہی پیدا ہو گا (ایضاً ص۱۴)

اسی طرح بائبل وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ کتابیں ہیں جن کے متعلق بے شرم لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں ان سے یہ قصے نقل کر لئے گئے ہیں (تفہیم القرآن جلد سوم ص۹۵)

"آخر ایک ہٹ دھرم اور بے حیا آدمی کے سوا کون اس کلام کو سن کر یہ کہہ سکتا ہے"۔ (ایضاً ص۲۹)

"کمینہ خصلت لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے"۔ (ص۲۰۸)

یہ تو چلئے غیر مسلموں کا معاملہ تھا وہ ان مسلمانوں کو بھی سخت لفظ ہی دیتے ہیں جو ان سے اختلاف کرتے ہیں کم سے کم انہیں قرآن کی معنوی تحریف کرنے والے" اور ظالموں کے القاب دیئے گئے ہیں تفہیم القرآن ص۹۶) پھر وہ مسلمان جنہوں نے مغربی طرز زندگی کو اپنا لیا ہے ان کے بارے میں کہتے ہیں :۔

"جو لوگ قرآن وسنت کے صریح احکام کے خلاف مغربی معاشرت کے طور طریقے اختیار کر لینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ پھر انہیں کو عین اسلام ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں ۔۔۔ وہ گناہ اور نافرمانی پر جہالت اور منافقانہ ڈھٹائی کا اضافہ کر لیتے ہیں جس کی قدر نہ دنیا میں کوئی شریف آدمی کر سکتا ہے نہ آخرت میں خدا سے امید کی جا سکتی ہے ۔۔۔۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ یہ خیالات رکھتے ہوئے بھی وہ مسلمان بنے پھرتے ہیں انسانیت کی اس سے زیادہ ذلیل قسم غالباً دنیا میں اور کوئی نہیں پائی جاتی"۔ (تفہیم القرآن جلد سوم ص۳۹۷)

ان خیالات کو اُس اصول کے تحت جانچیے کہ انہوں نے کتاب وسنت کو ماخذ احکام مان کر اختلاف کو محمود کہا تھا۔ چاہے مغرب کی تقلید کتنی ہی بڑی ہو جب تک کوئی مسلمان قرآن اور سنّت سے اُس پر استدلال کرتا ہے وہ اللہ اور رسول ہی کو آخری سند مان کر اپنے لئے راہ تلاش کرتا ہے اُسے انسانیت کی ایسی ذلیل قسم گردانا جو شاید کہیں نہیں پائی جاتی کوئی اچھا طرز تخاطب نہیں ۔ افسوس تو یہ ہے کہ مودودی صاحب ایک طرف تو سب کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر ان سے تفسیر میں کہیں کوئی کوتاہی یا غلطی سرزد ہو گئی ہو تو ان کی توجہ اس طرف دلائی جائے دوسری طرف وہ ان تمام لوگوں کو جو ان کی بعض مقامات پر کی گئی تفسیر سے متفق نہیں سرے سے مسلمان ہی سمجھنے کو تیار نہیں ۔

"جس شخص کا دل اگر قرآن کی بات پر یقین نہ کرنا چاہتا ہو تو اسے صاف کہنا چاہیئے کہ میں اس بات کو نہیں مانتا لیکن یہ بڑی اخلاقی بزدلی اور علمی خیانت ہے کہ آدمی قرآن کے صاف صاف الفاظ کو توڑ مروڑ اپنے من مانے معنی پر ڈھالے ۔۔۔۔ یہ قرآن کی تفسیر نہیں بلکہ تحریف اور اس سے بڑھ کر اس کی تغلیط ہے ۔۔۔۔ اب اگر کوئی شخص یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ۔۔۔ تو اسے صاف صاف کہنا چاہیئے کہ میں قرآن کی اس بات کو نہیں مانتا اپنے عدم ایمان کو اس پردے میں چھپانا کہ قرآن کے صریح اور صاف الفاظ میں اپنے من مانے

معنی بھر دیئے جائیں گھٹیا درجے کی منافقت ہے،، (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۵۷۳-۵۷۱)

اور یہ سب خطابات ان لوگوں کے لئے ہیں جو "جن" "طیر" "نمل" وغیرہ کے الفاظ جو سورۃ النمل میں آتے ہیں ان کا مجازاً استعمال ہونا بیان کرتے ہیں نا کہ حقیقتاً حالانکہ خود مودودی صاحب بھی استعارے اور مجاز کے طور پر الفاظ کا استعمال قرآن پاک میں تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ :۔

"حقائق کی سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی تو معنی اور روح کو دیکھے گا نہ کہ الفاظ اور اصطلاحات کو،، (ایضاً صفحہ ۴۳۸)

لفظوں کا مجازی استعمال تو قرآن میں کئی جگہ ہوا ہے مثلاً سورہ یٰسٓ میں لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا پر مودودی صاحب لکھتے ہیں :۔

"زندہ سے مراد سوچنے اور سمجھنے والا انسان ہے جس کی حالت پتھر کی سی نہ ہو،، (۳۶ : ۷۰)

یا مثلاً :۔

"ہاتھوں کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بطور استعارہ استعمال ہوا ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ معاذ اللہ وہ ذات پاک جسم رکھتی ہے اور انسانوں کی طرح ہاتھوں سے کام کرتی ہے،، (تفہیم القرآن چہارم صفحہ ۷۲)

یا مثلاً :۔

"وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذَا الْاَيْدِ (۳۸ - ۱۷) اصل الفاظ ہیں ذا الاید ہاتھوں والا۔ ہاتھوں کا لفظ صرف عربی زبان ہی نہیں دوسری زبانوں میں بھی قوت اور قدرت کے لئے استعارے کے طور استعمال ہوتا ہے،، (ایضاً صفحہ ۳۲۳)

یہ تو صرف چند مثالیں تھیں۔ انہوں نے اصولاً بھی اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ۔

"قرآن اگرچہ عربی میں نازل ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی ایک مخصوص اصطلاحی زبان بھی رکھتا ہے اس نے بکثرت الفاظ کو ان کے اصل لغوی معنی سے ہٹا کر ایک خاص معنی میں استعمال کیا ہے اور بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کو وہ مختلف مواقع پر مختلف مفہومات میں استعمال کرتا ہے،، (تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۱)

ایسے بین اصول کو قائم کر لینے کے باوجود مودودی صاحب دوسروں پر برس پڑیں تو یہ ان کی زیادتی نہیں تو کیا ہے سورہ سباء میں حضرت سلیمانؑ کے عصا کو گھن لگ جانے اور انکی وفات کے بارے میں

مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ :-

موجودہ زمانے کے بعض مفسرین نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ ......گھن سے مراد حضرت سلیمان کے بیٹے کی نااہلی ہے اور عصا سے مراد ان کا اقتدار ہے اور ان کے مردہ جسم کے گر جانے سے مراد اُن کی سلطنت کا پارہ پارہ ہوجانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اگر یہی مضمون بیان کرنا ہوتا تو کیا اس کے لئے عربی متن میں الفاظ موجود نہ تھے کہ اس ہیر پھیر کے ساتھ اسے بیان کیا جاتا۔ یہ پہیلیوں کی زبان آخر قرآن مجید میں کہاں استعمال کی گئی ہے اور اس زمانے کے عام عرب جو اس کلام کے اوّلین مخاطب تھے یہ پہیلی کیسے بوجھ سکتے تھے ؟" (تفہیم القرآن جلد چہارم صد ۱۹)

چنانچہ مودودی صاحب کو اوپر والی تاویلیں پسند نہیں وہ لفظوں کو ان کے عام معنوں اور اس سے عام اخذ کردہ مفہوم کو ہی صحیح سمجھتے ہیں۔ لیکن جب خود انہیں کوئی ایسی ہی مشکل پیش آتی ہے تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اصل لفظوں میں سے کوئی دوسرا پنہاں مضمون نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت سلیمان ہی کے ذکر میں آیت وَاُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (۱۰-۱۶) پر حاشیہ لکھتے ہیں کہ :-

"یعنی اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ ہے اس بات کو لفظی معنوں میں لینا درست نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اللہ کے بخشے ہوئے مال و دولت اور ساز و سامان کی کثرت ہے (تفہیم القرآن جلد سوم صد ۵۱۱)

اب اگر مودودی صاحب کے نزدیک کسی مقام پر لفظی معنوں میں کوئی مفہوم لینا درست نہیں تو پھر دوسرے مفسرین بھی اگر بعض مقامات کو لفظی معنوں میں نہیں لیتے تو اس پر اعتراض کیسا۔ مودودی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن میں پہیلیوں کی زبان کہاں استعمال کی گئی ہے ہم بھی مانتے ہیں کہ قرآن کے کسی مقام کو پہیلیوں کی زبان کہنا نہ صرف غلط ہے بلکہ گستاخی ہوگا مگر مودودی صاحب نے یوں بالواسطہ ان لوگوں پر طعن کیا ہے جو عصا اور گھن کے لفظی معنوں کو بدل کر ان سے علاماتی مفہوم اقتدار اور کمزوری کا لیتے ہیں۔ اگر ایسا کرنا پہیلی کی زبان بنا دینا ہے تو پھر سورۃ التین کی تفسیر میں مودودی صاحب نے وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ پر کیوں لکھا کہ :-

"اس میں شک نہیں کہ ایک عام عربی دان تین اور زیتون کے الفاظ سن کر وہی معنی لے گا جو عربی زبان میں معروف ہیں لیکن دو وجوہ ایسے ہیں جو یہ معنی لینے میں مانع ہیں ایک یہ کہ آگے طور سینا اور

شہر مکّہ کی قسم کھائی گئی ہے اور دو پھلوں کے ساتھ دو مقامات کی قسم کھانے میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی ۔" تفہیم القرآن جلد ششم صفحہ ۳۸۶)

"البتہ یہ طریقہ اہل عرب میں رائج تھا کہ جو پھل کسی علاقہ میں کثرت سے پیدا ہوتے ہوں اس علاقے کو بسا اوقات اس پھل سے موسوم کر دیتے تھے اس محاورہ کے لحاظ سے تین اور زیتون کے الفاظ کا مطلب مناتب تین و زیتون یعنی ان پھلوں کی پیداوار کا علاقہ ہو سکتا ہے اور وہ شام و فلسطین ہے ۔" (ایضاً صفحہ ۳۸۶)

یعنی اس کا مطلب یہی ہوا کہ انجیر اور زیتون کو شام اور فلسطین کے لئے بطور علامت استعمال کیا گیا ہے پھر وہ دوسروں کو یہ حق کیوں نہیں دیتے کہ وہ قرآن پاک کی بعض آیات سے ایسا مفہوم اخذ کریں ؟ اسی سورۃ السبا، میں مودودی صاحب نے فقالوا ربنا بٰعد بین اسفارنا (۳۴: ۱۹) "اے ہمارے رب ہمارے سفر کی مسافتیں لمبی کر دے") پر حاشیہ لکھا ہے کہ :۔

ضروری نہیں ہے کہ انہوں نے زبان ہی سے یہ دعا کی ہو ۔ دراصل جو شخص بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے گویا وہ زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ خدایا میں ان نعمتوں کا مستحق نہیں ہوں ۔" (تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۱۹۳)

طلوع و غروب آفتاب کے وقت نماز سے رک جانے والی ایک حدیث شریف پر مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ :۔

اس حدیث میں سورج کا شیطان کے سینگوں کے درمیان طلوع اور غروب ہونا ایک استعارہ ہے یہ تصوّر دلانے کے لئے کہ شیطان ان کے نکلنے اور ڈوبنے کے اوقات کو لوگوں کے لئے ایک فتنۂ عظیم بنا دیا ہے ۔" (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۶۳)

کیا یہاں لفظوں میں پنہاں کسی بہت بڑی حقیقت اور امتحان کا ذکر نہیں جو غروب اور طلوع کے اوقات میں انسان کو فتنہ میں ڈال دیتے ہیں ۔

یا مثلاً :۔

"اصل میں لفظ کرسی استعمال ہوا ہے جسے بالعموم حکومت و اقتدار کے لئے استعارے کے

طور پر بولا جاتا ہے اردو زبان میں بھی اکثر کرسی کا لفظ بول کر حاکمانہ اختیارات مراد لیتے ہیں" (تفہیم القرآن جلد اول ص۱۹۵)

جیسا خود مودودی صاحب استعارہ۔ زبان حال۔ اور علامت کی زبان کو قرآن پاک اور حدیث میں استعمال ہونا درست سمجھتے ہیں اور اس کو پہیلی کی زبان نہیں کہتے تو پھر دوسروں کو اس تشریح کا طعنہ کیوں دے رہے ہیں: ـــ

اس قسم کی جانبداری کی بے شمار مثالیں مودودی صاحب کی تفسیر میں ملتی ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ اس میں سوائے دو ایک مقام کے بیشتر جگہوں پر تو پرانی روش کے ترجمہ اور تفسیر ہی کو درست سمجھا گیا ہے جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا تھا مودودی صاحب نے تفسیر تفہیم القرآن لکھنے کی وجہ یہی بیان کی تھی کہ گذشتہ تفسیروں کی بعض خامیوں اور خلاؤں کو پُر کیا جائے اور اگر کوئی کسر پہلے رہ گئی ہے تو وہ دور کر دی جائے۔ یہ درست ہے کہ ان کی تفسیر میں انبیاء کے واقعات تاریخی نظائر اور دساتیر۔ احکامات اور حدود کے بارے میں بہت لمبی بحثیں درج ہیں۔ عبارت کی چستی بندش اور وکیلانہ استدلال کی چابکدستی تو ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ اس سے کسی خامی یا کسر کو کما حقہٗ پورا کر دیا گیا ہے تو یہ درست نہیں۔ انہوں نے نفسِ تفسیر نویسی کے اعتبار سے ایک عام مولوی کی بیان کردہ تفسیر سے بالاتر کوئی محققانہ اضافہ تفسیری ادب میں نہیں کیا۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ضرور ہی تشریح و تفسیر کو روایتی نکتہ نظر سے مختلف ہی ہونا چاہیے تبھی اسے بہتر اور محققانہ کہا جاسکتا ہے ہمارا مطلب یہ ہے کہ وہ مقصود جس کو حاصل کرنے کے لئے یہ تفسیر لکھنے کی سعی کی گئی ہے وہ پورا نہیں ہوا کیونکہ تمام وہ غلط کہانیاں تشریحات اور استنباط جن کے سبب ماضی میں مخالفین اسلام نے اسلام۔ قرآن اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کر کے خلقِ خدا کو اسلام کے قریب آنے سے روک دیا تھا اگر ان کہانیوں۔ تشریحات اور طریقہائے استدلال کو پھر سے درست مان کر صحیح اسلام کی شکل میں پیش کیا جائے اُن قباحتوں کو محاسن سمجھ لیا جائے تو اسے کسی خامی کا پُر ہو جانا نہیں کہا جاسکتا: ـــ

یہی نہیں مودودی صاحب کی تفسیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر جادو ہوا تھا اور حضورؐ اس سے متاثر ہوئے تھے (جلد ششم ص۵۵۳)

غزوہ بدر کے اسیروں کو قتل نہ کرنا غلطی تھی اور اسی پر سرزنش ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ

مودودی صاحب کے نزدیک یہاں اہل تاویل کی رائے سے ذرا ہٹ کر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بجائے مسلمانوں پر ان آیات میں اللہ کا عتاب آتا رہا ہے کہ انہوں نے کیوں کفار کے لوگوں کو اسیر بنا یا اور فدیہ طے کر کے چھوڑ دیا حالانکہ حضورؐ نے مشورہ ابوبکرؓ پر ایسا کیا تھا۔ (جلد دوم ص۱۵۹)

اسی طرح حضرت زینبؓ کی حضرت زید سے طلاق اور حضورؐ سے شادی کے بارے میں بھی مودودی صاحب نے کہا کہ اللہ تعالے نے حضور پر عتاب فرمایا کہ انہوں نے کیوں قصداً زید کو طلاق سے روکا تاکہ وہ اس کام سے بچ جائیں جو اللہ تعالے ان سے کرانا چاہتا تھا یعنی حضرت زینب سے شادی (جلد چہارم ص۱۱۰)

اسی طرح سورۃ تحریم کی تفسیر میں انہوں نے ازواج مطہرات کے بارے میں ہونے والے بعض واقعات کا ذکر کیا ہے اور صاف تاثر دیا ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کوئی حضورؐ سے زبان درازی کی مرتکب ہوئی تھیں اور کہ "صرف ایک غبی آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ زبان درازی نہیں" (جلد ششم ص۲۵)

یہ تو صرف وہ چند امور ہیں جن کی طرف ہم نے توجہ دلائی ہے۔

لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ہم نے تفہیم القرآن کو ہرگز اس نظر سے نہیں پڑھا کہ ہم اس میں اختلاف کرنے کے لئے ایسے مقامات تلاش کریں جس پر ہم حرف گیری کر سکیں۔ ایک ایسے اندیشے کو دور کرنے کے لئے ہم نے اس تفسیر پر خود اس کے مداحوں کے مضامین بھی پڑھے ہیں تاکہ ہمیں اس تفسیر کے محاسن سے آگاہی ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی بات ہماری نظر سے اوجھل رہ گئی ہو۔ ہم نے ہفت روزہ آئین لاہور کا خاص "تفہیم القرآن نمبر" بھی دیکھا جس میں کالجوں کے پروفیسر صاحبان کے مضامین بھی ہیں اور وکلا صاحبان کے پیغامات بھی۔ جماعت اسلامی کے ادیبوں کی نگارشات بھی ہیں۔ اور مولوی صاحبان کی آراء بھی۔ ہمیں علم نہیں کہ بعض بڑے حضرات نے واقعی اتنی طویل تفسیر کو پڑھ کر رائے لکھی ہے ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے پڑھ کر ہی رائے ظاہر کی ہو گی لیکن انہوں نے اس کے محاسن کی کوئی نشاندہی نہیں کی۔ حالانکہ رائے ظاہر کرتے وقت ایسا کرنا یقیناً دوسروں کے لئے ممد ہوتا۔

البتہ مودودی صاحب کے ایک ساتھی اسعد گیلانی صاحب نے ہفت روزہ ایشیا میں مختصر مضمون بعنوان "مولانا سید ابوالاعلی مودودی صاحب کا تفسیری کارنامہ" لکھا دیکھا ہے جس میں مختصراً اس تفسیر کے محاسن بیان کئے ہیں وہ لکھتے ہیں :۔

تفہیم القرآن بے شمار خصوصیات کی حامل تفسیر ہے اور مولانا مودودی وسیع الاطراف جدید وقدیم علوم پر جامع معلومات ونظر رکھنے والے مفسر دین جہاں وہ اسلاف کی قدیم ترین تفاسیر سے حوالے دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہاں وہ جدید سائینٹیفک معلومات کو قرآن کے سانچے میں ڈھالتے اور قانون قدرت کے پیمانے سے ناپتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کسی مسئلے میں بھی کہیں منفرد نظر نہیں آئے جو بات بھی بیان کرتے ہیں ان کے ساتھ اکابر علماء سلف کی ایک قطار کھڑی دکھائی دیتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلاف سے ہٹ کر انہوں نے ایک قدم بھی تفسیر کی اس وادی پُرخار میں نہیں رکھا صرف انداز بیان لہجہ مسائل کا استخراج وتجزیہ ۔ دلائل اور قرآنی حکمت کا مسائل حاضرہ پر انطباق ان کا اپنا حصہ ہے [۱]

پھر وہ تفسیر تفہیم القرآن کی خصوصیات گناتے ہیں : ـــ

"تفہیم القرآن کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے مخاطب کا خصوصی انتخاب ہے ۔ ۔ ۔ اس کا خصوصی مخاطب دور جدید کے عالم اسلام میں مسلمانوں کی سوسائٹی کا کارفرما طبقہ ہے یہ کارفرما طبقہ جدید جدید علوم سے آراستہ جدید ذہن ونظر کا حامل جدید تہذیب سے مرعوب اور کچھ کچھ متاثر ۔ جدید سائنسی ایجادات کا معترف اور ان سے پوری طرح استفادہ کرنے کا قائل اور جدید یورپی قوتوں کی ترقیات کو ان کی تہذیب اور کلچر کا مذہب سمجھنے کے معاملے میں مبتلا نظر آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مولانا مودودی کی علمی زندگی عملی جدوجہد نظام فکر اور اسلام کے بارے میں ان کے جامع اور وسیع تصور کا نچوڑ اور خلاصہ موجود ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے باہر مولانا مودودی کی فکر کا کوئی گوشہ موجود نہیں ہے ۔

اس کی تیسری خصوصیت اس کی راست فکری اور راست روی ہے الٰہیات کے پیچ درپیچ مباحث سے آزاد اور مبرا جس انداز میں قرآن سوچتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا مودودی نے اسی کا اتباع کیا ہے [۱۱]

ہمیں مسلم ہے کہ تفسیر تفہیم القرآن میں موری جس کا خیال رکھا گیا ہے مواد کی فراہمی اور اپنے نظریات میں اُسے ڈھالنے پر بہت محنت اور وقت صرف کیا گیا ہے ۔ کتاب میں بعض تاریخی مقامات کی تصویریں یا دینی حرب کے عسکری خاکے اور بعض نقشے درج فرما کر معلومات کے سمجھنے میں آسانیاں

فراہم کی گئیں ہیں۔ بعض طویل بحثوں میں بیشتر کتب سے حوالوں کو اس انداز میں ترتیب دیا گیا ہے کہ وہ مودودی صاحب کے مطالب کو واضح کرسکیں لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جہاں بات ان کے مطلب سے ٹکراتی تھی وہاں ان کے مخالف سلف صالحین کے نظریات کو قطعی حذف کر دیا گیا ہے۔ مثلاً معراج نبویؐ کے بارے میں صحابہ کرامؓ میں بھی اس کی کیفیت جسمانی یا روحانی کے بارے میں اختلاف رہا اور حضرت عائشہؓ جیسی عظیم خاتون جو حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے قریب تر تھیں وہ بھی اسے ایک روحانی کیفیت ہی سمجھتی تھیں۔ مودودی صاحب کے لئے دیانت داری کا تقاضا یہی تھا کہ وہ دونوں گروہوں کے خیالات کا ذکر فرما دیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہی کیفیت اور بھی بیشتر مسائل میں رہی ہے۔ شاید ان باتوں کو اسعد گیلانی صاحب الٰہیات کی پیچیدگیوں سے آزاد رہنے کی خواہش قرار دیں لیکن آخر معراج جسمانی قرار دینے میں بھی تو الٰہیات کی پیچیدگی کے دخل کا خطرہ موجود تھا۔ اسعد صاحب نے تفہیم القرآن کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے مخاطب کا خصوصی انتخاب بیان کی ہے۔ اب فرق صرف اس قدر ہے جہاں اسعد صاحب وہ مخاطب "دورِ جدید کے عالم اسلام کا کارفرما طبقہ" قرار دیتے ہیں مودودی صاحب خود اسے اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ جو عربی سے اچھی طرح واقف نہیں" بیان کرتے ہیں۔ اس طبقہ میں اسلام کو دوبارہ راسخ کرنے اور اسے تہذیب جدید کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچانے میں یہ تفسیر کس حد تک کامیاب ہوگی یہ تو وقت ہی بتا سکے گا۔ ہمیں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کی اپیل صرف اسی طبقہ کو ہے جو پرانے خیالات اور آباؤ اجداد سے مل جانے والے اعتقادات کو دین سمجھ بیٹھا ہے جس میں غلط حمیّتِ قومی گھر کر گئی ہے اور وہ اپنے اس قومی مسلک کو اسلام کہہ کر اسے درست ثابت کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے مسلمانوں کے اس طبقہ کو مودودی صاحب نے سہارا فراہم کرایا ہے اور ان آبائی اعتقادات کو اپنے قلم کے زور سے درست تسلیم کروانے کی سعی کی ہے اور اس طبقہ کو اس پر فخر و ناز کرنے پر ابھارا ہے۔ آیا یہ تفسیر کسی غیر مسلم کو مسلمان بنا سکتی ہے یا نہیں ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے کیوں کہ جیسا کہ صاحب تفسیر کی باتوں سے خیال گذرتا ہے غیر مسلم اس تفسیر کے مخاطب ہیں ہی نہیں۔

ایک اور صاحب جناب پروفیسر خورشید احمد نے بھی اس کتاب پر اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ ان کا مضمون بعنوان "کتاب انقلاب ـــــ تفہیم القرآن (ایک تاثراتی مطالعہ)" ہے۔ اس میں سب

سے اہم بات جو پروفیسر موصوف نے کہی ہے وہ ہمارے خیال میں دورِ حاضر کے بنیادی چیلنج کی نشان دہی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے :۔

۱ ۔"دورِ جدید میں تقریباً عالمگیر پیمانے پر وحی کا انکار یا اس سے صرفِ نظر کر کے زندگی کا پورا نقشہ ذاتی اور قومی تعصبات یا لادینی نظریات کی روشنی میں تعبیر کرنا ــــــ اشتراکی دنیا اور مغرب کی لادینی اقوام کے تصوّرات اسی ذیل میں آتے ہیں ہندومت۔ بدھ مذہب اور دوسرے غیر الہامی مذاہب کے پیرو بھی ایک حد تک اسی گروہ میں شامل ہیں۔

ب ۔ جو وحی کے قائل ہیں وہ بھی اس سلسلہ کو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم تک تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس وحی کو آخری سمجھتے ہیں جو ان کے نبی پر نازل ہوئی۔ اسلام کو وہ مبنی بر وحی مذہب تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

یہودیت اور عیسائیت کے پیرو اس گروہ سے متعلق ہیں ۔

ج ۔ مسلمان جو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم کو نبی برحق سمجھتے ہیں ان کا ایک بڑا حصّہ عملاً دین و دنیا کی تقسیم و تفریق کا قائل اور اس پر عامل ہو گیا ہے۔

(۱) اس تفریقِ دین و دنیا کی ایک مذہبی روایت (VERSION) ہے جس میں دین کو انفرادی زندگی کے چند خاص دائروں اور اجتماعی زندگی کے چند مظاہر تک محدود کر لیا گیا ہے ۔

(۲) اور ایک دنیاوی سلسلہ ہے جس میں گو اجتماعی اور ایک حد تک انفرادی زندگی کے لئے دین کو ترک تو نہیں کیا گیا مگر اس کی اصل تعلیمات کے حقیقی مفہوم کو تبدیل کر دیا گیا ہے یا کیا جا رہا ہے یہ گروہ اسلام کا پیوند دوسرے نظاموں اور نظریات سے لگاتا ہے اور اسلام کے احکام کی ایسی تاویلات کرتا ہے جو دراصل تحریف کے مترادف ہیں۔ جس چیز کو ہم دورِ جدید کا چیلنج کہتے ہیں وہ ان ــــــ چار چیلنجوں پر مشتمل ہے :ــــ

اوّل الذکر کے مقابلہ میں تفہیم القرآن نے وحی کا اثبات کا رویہ اختیار کیا ہے اور محکم دلائل سے بتایا ہے کہ انسان خدا کی رہنمائی کا محتاج ہے ۔

ثانی الذکر کے مقابلہ میں تفہیم القرآن نے یہ دکھایا ہے کہ جو اپنے آپ کو وحی کا اجارہ دار سمجھ رہے

ہیں وہ کتمان حق اور التباس حق کے مجرم ہیں۔

آخر الذکر دونوں گروہوں کو مخاطب کر کے تفہیم القرآن ان کی غلطیوں کو قرآن اور عقل کی روشنی میں بیان کرتی ہے۔ (ہفت روزہ آئین لاہور دسمبر ۱۹۷۶ء)

ہم نے پروفیسر صاحب کے بیان کردہ امور کے جوابات کو تفہیم القرآن میں تلاش کرنے کی کوشش کی تاکہ جو شکوک اور اشکالات دور جدید نے انسانی ذہنوں یا مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں پیدا کر دیئے ہیں ان کا ازالہ کرنے کا مواد مل سکے۔ ہم افسوس سے کہتے ہیں کہ جس طرح پروفیسر صاحب نے کہا ہے۔ ویسا مواد ہمیں تفہیم القرآن پڑھنے سے نہیں مل سکا۔ ہم مانتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں عالمگیر پیمانے پر وحی کا انکار ہوا ہے لیکن صرف یہ کہہ دینا کہ انسان وحی کا محتاج ہے اور اسے آسمانی راہ نمائی ملنی چاہیئے مسئلہ کا حل نہیں وحی کا انکار جماعت اسلامی کے نزدیک شاید صرف یہی ہے کہ ریاست خود کو مصدر حاکمیت یا مصدر قانون سمجھے اور قوانین کے لئے کسی بالاہستی کے اختیارات کو تسلیم نہ کرے۔ لیکن یہ تو بہت بعد کا درجہ ہے۔ پہلا درجہ تو خود خالق کائنات اور کسی وحی کے مصدر ہی کا ہے۔ مودودی صاحب نے اپنی منطق اور استدلال کے زور سے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ کائنات کا چونکہ ایک خالق ہے اس لئے امر اور حکم صرف اسی کا ہے لیکن انکار آج خود خالق کائنات کا ہی ہو رہا ہے اور وحی کا انکار بھی دراصل اسی لئے ہے کہ خالق کو تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے اور اس کی وجہ جیسا کہ مودودی صاحب اور پروفیسر صاحب تسلیم کریں گے یہی تو ہے کہ:۔

"جو چیز نبی اور غیر نبی کے درمیان فرق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک غیر نبی آخرت کے حق میں جو مضبوط سے مضبوط دلائل دے سکتا ہے ان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس یہی ہو سکتا ہے کہ آخرت کے نہ ہونے کی بہ نسبت اس کا ہونا معقول تر اور اغلب تسلیم کر لیا جائے۔۔۔۔ فلسفی اگر واقعی صحیح الفکر فلسفی ہو تو وہ ہونا چاہیئے سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے اور یقیناً ہے کہنا صرف ایک نبی کا کام ہے۔"
(تفہیم القرآن جلد پنجم ص ۵۳۵)

اب یہ تو سچ ہے کہ مودودی صاحب کو نہ صاحب الہام ہونے کا دعویٰ ہے نہ وہ وحی ولایت کے جاری رہنے کے قائل ہیں۔ چونکہ وہ خود صاحب تجربہ نہیں وہ وحی کے انکار اور اقرار کی بحث میں زیادہ تر ایک فلسفی ہی کے دلائل دے سکتے ہیں جو "چاہیئے" سے آگے نہیں جا سکتا۔ اس کا اقرار وحی

کا درجہ بھی کسی انکار وحی کرنے والے فلسفی سے کسی طرح مختلف نہیں کیونکہ دونوں کا عقلی قیاس درست اور غلط ہو سکتا ہے۔ زمین پر انسان نے اپنی حاکمیت کا اعلان تبھی کیا جب اس نے وحی الٰہی سے انکار کیا اور وحی الٰہی ہی آخرت پر یقینی ایمان پیدا کر سکتی ہے۔ تعجب ہے کہ جو شخص خود یہ کہتا ہو کہ دور جدید میں تقریباً عالمگیر پیمانے پر وحی کا انکار ہوا ہے اور جو یہ لکھے کہ غیر نبی صرف چاہیے تک راہ نمائی کر سکتا ہے۔ یقینی ہے کی قلمرو میں اس کی دسترس نہیں وہ وحی کو بند بھی کہتا چلا جائے۔ کیا اس تضاد حیثیت کا انہیں شعور نہیں۔ انکار وحی کا مطلب یا تو یہ ہے کہ خدا سرے سے ہے ہی نہیں وحی الٰہی کیسی؟ یا پھر یہ کہ وہ ہے تو سہی لیکن ہمیں اس کی وحی کی ضرورت نہیں۔ نتیجے کے اعتبار سے دونوں قسم کے انکار آخر ایک ہی طرح کا پھل لاتے ہیں جو انکار باری تعالے ہی ہے۔

پھر پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ وہ لوگ بھی جو وحی کے قائل ہیں وہ بھی اس کے سلسلہ کو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تک تسلیم نہیں کرتے بلکہ اگلی وحی کو آخری سمجھتے ہیں جو ان کے نبی پر نازل ہوئی۔ جہاں تک نفس وحی کا تعلق ہے (شریعت کا نہیں) کیا یہی پوزیشن خود مودودی صاحب اور ان کے ہمنواؤں کی نہیں جس کا الزام وہ یہود و نصاریٰ پر رکھتے ہیں مودودی صاحب خود قائل ہیں کہ مستقل شریعت صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تھی۔ باقی انبیائے بنی اسرائیل شریعت موسوی ہی کے پیرو تھے:....

"بس.... وجہ مماثلت جس کی بناء پر آنے والے نبی کی تخصیص قابل فہم ہو اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ وہ نبی ایک مستقل شریعت لانے کے اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کے مانند ہو اور یہ خصوصیت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی کیونکہ آپ سے پہلے بنی اسرائیل میں جو بھی آئے تھے وہ شریعت موسوی کے پیرو تھے۔ ان میں سے کوئی بھی مستقل شریعت لے کر نہ آیا تھا۔" (تفہیم القرآن جلد پنجم ص۴۶)

اس سے ظاہر کہ وحی صرف شریعت نہیں بلکہ شریعت کے بغیر بھی ہوتی ہے کیونکہ بنی اسرائیل کے وہ انبیاء جن کا ذکر مودودی صاحب نے کیا ہے صاحب وحی تو ضرور تھے گو بقول ان کے صاحب شریعت مستقلہ نہ تھے۔ اب اگر وحی کا نزول یہود و نصاریٰ صرف اپنے انبیاء تک مانتے ہیں اور ان کی بعثت کے بعد نزول وحی کو منقطع سمجھتے ہیں تو مودودی صاحب حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر قسم کی وحی

کو منقطع سمجھتے ہیں وہ تو حضرت مسیح کے نزول ثانی میں بھی وحی کے اجراء کے قائل نہیں۔ ایک طرف یہ حالت ہے دوسری طرف یہی لوگ اس دور کے مرض کی شناخت وحی کا انکار کرتے ہیں۔ اگر مرض کا ازالہ صرف گذشتہ وحی کے حوالہ اور محکم دلائل سے ہی کیا جاتا ہے تو پھر اس وحی کا حوالہ ہر امت اپنی کتاب اور اپنے نبی کی بعثت تک محدود کر کے دے سکتی ہے اس میں اس اسلام کا اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ (آل عمران ۳ : ۱۸) ہونا کس طرح مخصوص ہو گا جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آیا مودودی صاحب اس کا اثبات محض ماضی کے حوالوں سے کرتے ہیں وہ تو کوئی یہودی اور نصرانی بھی کر سکتا ہے۔ پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ تفہیم القرآن نے ثابت کیا ہے کہ یہود نصاریٰ جو خود کو وحی کا اجارہ دار سمجھتے ہیں کتمان حق کے مجرم ہیں کیا خود مودودی صاحب عامۃ المسلمین کو بھی اس جرم کا سزاوار نہیں ٹھہراتے۔

"تفسیر تفہیم القرآن میں مودودی صاحب نے مسلمانوں کو بھی اہل کتاب مسلمان کہہ کر پکارا ہے جس سے شاید خود کو الگ سمجھتے ہوں۔ لیکن کس بناء پر وہ عام مسلمانوں سے الگ ہیں؟ کیا ان کا اپنا وحی کا علم بھی صرف سماعی نہیں؟ ان کی اپنی گواہی یا تجربہ اس پر کوئی نہیں تو پھر وہ دوسروں کو ملزم کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :۔

"تم نے (یعنی یہودیوں نے۔ ناقل) اس رسول کو اس لئے ماننے سے انکار کیا کہ یہ اس قوم میں مبعوث ہوا تھا جسے تم حقارت کے ساتھ امی کہتے ہو۔ تمہارا زعم باطل یہ تھا کہ رسول لازماً تمہاری اپنی قوم کا ہونا چاہیے تم یہ فیصلہ کئے بیٹھے تھے کہ تمہاری قوم سے باہر کا جو شخص بھی رسالت کا دعویٰ کرے وہ ضرور جھوٹا ہے کیونکہ یہ منصب تمہاری نسل کے لئے مختص ہو چکا ہے اور امیوں میں کوئی رسول نہیں آ سکتا۔"

(تفہیم القرآن جلد پنجم صد ۴۸۳)

اور یہ بھی لکھا ہے کہ :۔

"وہ صاف کہتے تھے کہ جو کچھ ہمارے یہاں آیا ہے ہم صرف اسی کو مانیں گے دوسری کسی تعلیم کو جو کسی غیر اسرائیلی نبی کے ذریعہ سے آئے خواہ وہ خدا ہی کی طرف سے ہو تسلیم کرنے کے لئے وہ قطعی تیار نہ تھے۔" (ایضاً صد ۸۵)

کیا خود مودودی صاحب نے کسی مزعومہ ریکارڈ کے بھروسہ پہ نہیں کہا تھا کہ :۔

"اب اگر بالفرض محال نبوت کا دروازہ واقعی کھلا ہوا ور کوئی نبی آبھی جائے تو ہم بے خوف وخطر اس کا انکار کر دیں گے"۔ (تفہیم القرآن صفحہ ۱۵۱)

حالانکہ وہ خود فرماتے ہیں کہ:۔

"اس طرح نبوت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی وہ حجت ہے جو اس نے انسانوں پر قائم کر دی ہے اور اس کے ماننے یا نہ ماننے پر انسان کے مستقبل کا انحصار ہے"۔ (تفہیم القرآن جلد ششم صفحہ ۴۹)

کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ اور ان کی طرح کے تمام لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر کفر کا فتویٰ اس لئے لگاتے ہیں کہ انہوں نے وحی پانے کا دعویٰ کیا حالانکہ وہ کسی نئی شریعت کے لانے کے مدعی نہ تھے بلکہ اسی وحی کے پانے کا اقرار کرتے تھے۔ جو زیر سایہ نبوت محمدیہ اولیائے امت کو ملتی ہے اور سلسلہ نبوت پر ایک گواہ کا کام کرتی ہے۔ وہی گواہی جو ہمیشہ سے انسانوں کو وحی کی حقانیت پر مطلوب رہی اور جسے مودودی صاحب نے اللہ تعالیٰ کی حجت کہا ہے۔ یہاں اس کا اللہ تعالیٰ کی حجت ہونا اسی لئے تو ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آپ ظاہر کیا اور اَنَا الْمَوْجُوْدُ کہہ کر انسانوں کو پکارا ورنہ انسانوں کے پاس عذر ہوتا کہ فلسفی کی ٹامک ٹوئیوں سے زیادہ ہمارے پاس کوئی یقینی گواہی موجود نہ تھی۔ وہ فلسفی کا غالب امکان ہی رہتا نہ کہ نبی کی یقینی حقیقت ہوتا۔ اس اعتبار سے نبوت کا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حجت ہونا مطلق وحی کے نزول کی نسبت سے ہے نہ کہ شریعت کے نزول کے حوالے سے کیونکہ کسی شریعت کا قبول بذات خود وحی کے شکوک وشبہات سے پاک قبول کرنے پر منحصر ہے یوں وحی کا درجہ اولیت کا ہے اور شریعت اس سے نمو پاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر وحی شریعت کی حامل ہو گو شریعت وحی کے ذریعے ہی دی جاتی ہے۔

یہ تو وحی اور کتمان حق کا مسئلہ ہے۔ لیکن عیسائیوں کے عقاید کو غلط ثابت کرنے میں جو کچھ کہ مودودی صاحب نے تفسیر تفہیم القرآن میں کہا ہے اس کے بارے میں ہم مختصراً پیچھے لکھ آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے اسے نظریاتی اختلاف کہہ کر پکارا جائے۔ لیکن پروفیسر صاحب یہ تو مانیں گے کہ کسی بھی انسان کو انہی کتب اور عقاید پر جوابدہ قرار دیا جا سکتا ہے جنہیں وہ تسلیم کرتا ہو جو کتابیں اس کے نزدیک مستند ہی نہیں ان پر بحث کرنا کہ وہ دراصل مستند ہیں۔ اور ان میں بیان کردہ عقاید درست ہیں۔ محض وقت کا زیاں ہی تو ہے۔ مودودی صاحب نے تقریباً دس صفحے (۶۶ سے ۷۶ تک)

بھاوپرتم) انجیل برنا باس کو مستند ثابت کرنے اور اس سے اقتباسات نقل کرنے پر صرف کر دیئے ہیں حالانکہ انجیل برنا باس مسیحیوں کے نزدیک ناقابل اعتبار اور مشکوک الصحت ہے اب انہیں اس سے ملزم کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے ۔ یوں نہ تو عقلاً اور نہ ہی نقلاً ۔ تفسیر تفہیم القرآن میں عیسائیوں کے عقاید کا غلط ہونا ثابت کیا جاسکا ہے یہودیوں کے بارے میں تو بحث اس سے بھی کہیں زیادہ محدود ہے ۔ ان دو حاملان وحی کو تفسیر مذکور کسی طرح بھی مسلمانوں اور اسلام کی طرف سے کما حقہٗ قائل کرتی نظر نہیں آتی ہے : ۔

اسی طرح پروفیسر صاحب نے جن دو چیلنجوں کا جواب تفسیر مذکور میں دیا جانا بیان کیا ہے ۔ وہ ممکن ہو ہی نہیں سکا ۔ رہا آخر الذکر دونوں چیلنج جن کے تحت وہ مسلمانوں کی غالب اکثریت کو دین و دنیا کی تفریق یا دو بنیادی اور اجتماعی مسائل میں دین کے حقیقی مفہوم کو بدل دینے کے اقدام کا مرتکب سمجھتے ہیں اس میں تفسیر مذکور نے مودودی صاحب کے معروف سیاسی مسلک کا تتبع کیا ہے ۔ ہم اسلام کو زندگی کا مکمل نظام سمجھتے ہیں جو فرد کو رضاکارانہ طور پر ایمان لے آنے کے بعد اپنی زندگی پر نافذ کرنا ہوتا ہے شریعت اس بات کی محتاج نہیں کہ ضرور ایک حکومت ہی ہو تبھی مسلمان اسے اپنے روزمرہ اعمال پر نافذ کر سکتا ہے ۔ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے جو ایک عرصہ دراز سے مسلمانوں کے بعض دانشوروں کو پیش ہے ۔ وہ اسلام اور حکومت کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں ان کے نزدیک دین و دنیا کی تفریق کا مطلب حکومت اور عبادت کے دو الگ الگ حلقے قائم کرنا ہے حالانکہ کوئی مسلمان چاہے وہ کسی کافر حکومت کے ماتحت ہی رہ رہا ہو اسلام کے ان تقاضوں کو پورا کرنے سے احتراز نہیں کر سکتا جنہیں وہ حکومت پر قابض ہوئے بغیر اپنی زندگی میں نافذ کر سکتا ہو وہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ یہاں اسلامی حکومت نہ تھی اس لیے میں نے اسلام کے مطالبات پورے نہیں کیے ۔ شریعت مسلمان سے علاحدہ کوئی چیز نہیں ۔ یہاں مسلمان سے مطلب وہ مسلمان ہے جو اسلام کو اپنا دین سمجھ کر اس پر عامل ہونا چاہیے ۔

دراصل دین کے مفہوم بدلنے کا مرض بھی کمزوریٔ ایمان اور وحی کے عدم یقین کا نتیجہ ہے ۔ ورنہ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اسلام کا تقاضا کیا ہے ۔ اس کا مفہوم بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ لیکن ایک طرف تو مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا دوسروں پر مفاہیم بدلنے کا الزام لگاتے ہیں تو دوسری طرف وہ خود بھی مطلب کے مطابق مفہوم کو بدلتے ہیں وہ تمام مسلمانوں کو اہل کتاب تک کہہ جانے میں بھر

انہی سے دوسرے مسلمانوں کو کافر کہلوانے کے مطالبے بھی کرتے ہیں اور انہی کے ووٹوں سے اسمبلیوں کی رکنیت کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ کیا یہ خود ایک متضاد طرز عمل نہیں۔ مودودی صاحب کا رویہ کس قدر مصلحتوں کا مرہون منت ہے وہ تو اس سے ظاہر ہے کہ قادیانی احمدیوں کے مسلک اجرائے نبوت کی بحث میں وہ ایک اصول بیان فرماتے ہیں :۔

"نبوت کا معاملہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ ہے۔ قرآن مجید کی رو سے اسلام کے ان بنیادی عقاید میں سے ہے جن کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا انحصار ہے ایک شخص نبی ہو اور آدمی اس کو نہ مانے تو کافر اور وہ نبی نہ ہو اور آدمی اس کو مان لے تو کافر" (تفہیم القرآن جلد چہارم ص۱۵۱)

اور اسی بناء پر احمدیوں کو کافر قرار دلواتے ہیں کہ ان کے نزدیک حضرت مسیح موعودؑ نے دعویٰ نبوت کیا تھا۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانتے ہیں اور پھر بھی کہتے ہیں کہ :۔

"اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ .... وہ اپنے نام سے کسی نئے مذہب کی بناء ڈالنے نہیں آئے تھے ان کی دعوت اسی دین کو تازہ کرنے کی طرف تھی۔ جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء علیہم السلام لے کر آئے تھے۔ اس لئے انہوں نے عام بنی اسرائیل اور پیروان شریعت موسوی سے الگ نہ کوئی جماعت بنائی نہ اس کا کوئی مستقل نام رکھا ان کے ابتدائی پیرو خود بھی نہ اپنے آپ کو اسرائیلی امت سے الگ سمجھتے تھے نہ ایک مستقل گروہ بن کر رہے اور نہ انہوں نے اپنے لئے کوئی امتیازی نام اور نشان قرار دیا وہ عام یہودیوں کے ساتھ بیت المقدس کے ہیکل میں عبادت کرنے کے لئے جاتے تھے اور اپنے آپ کو موسوی شریعت ہی پر عمل کا پابند سمجھتے تھے (ملاحظہ ہو کتاب اعمال ۳:۱) آگے چل کر جدائی کا عمل دو جانب سے شروع ہوا ایک طرف حضرت عیسیٰؑ کے پیروؤں میں سے پولوس نے شریعت کی پابندی ختم کرنے کا اعلان کر دیا کہ بس مسیح پر ایمان لے آنا نجات کے لئے کافی ہے اور دوسری طرف یہودی علماء نے پیروان مسیح کو ایک گمراہ فرقہ قرار دے کر عام بنی اسرائیل سے کاٹ دیا۔" (تفہیم القرآن جلد اوّل ص۱۷۵-۱۸۵)

یعنی حضرت مسیح کے آنے پر یہودیوں میں اس قسم کا کفر و اسلام کا کوئی مسئلہ ہی پیدا نہ ہوا تھا۔ جو مودودی صاحب نے بطور اصول اوپر بیان کیا تھا اور کسی نبی کے آنے کو ایک ازلی

معاملہ کیا تھا۔ اگر یہ کوئی اُصول ہے کہ نبی کے آنے پر ضروری اس کے ماننے والے آبائی گروہ سے کٹ جائیں تو پھر مسیحؑ نے خود کیوں نہ مکفر یہودیوں سے علاحدہ اپنی جماعت بنائی اور کیوں ان کے پیرو مودودی صاحب کے کہنے کے مطابق بنی اسرائیل ہی کا حصّہ بنے رہے حالاں کہ مسیح ایک مطاع نبی تھے۔ اور ان کا انکار کفر تھا۔ اور یہودی ان کے منکر تھے۔ مودودی صاحب کا وہ نازک اصول جو مسیح اور یہودیوں کے بارے میں ہے۔ احمدیوں کے بارے میں کیوں بدل جاتا ہے حالانکہ احمدی بیشک قادیانی ہوں یا لاہوری شریعت محمدی ہی کے پابند ہیں۔ اگر قادیانی احمدیوں کے بارے میں مودودی صاحب کو کوئی مجبوری لاحق تھی تو لاہوری احمدیوں کے بارے میں تو ایسی کوئی مجبوری انہیں درپیش نہ تھی کیا وہ آج سے تقریباً بتیس سال قبل خود نہیں کہہ چکے کہ لاہوری احمدی ملّتِ اسلامیہ کا حصّہ ہیں۔ انہیں کافر نہیں کہا جا سکتا۔ اس پر ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط گواہ ہے جس کی وہ آج بھی تردید نہیں کر سکتے۔ تو پھر انہوں نے لاہوری احمدیوں کو کس بات پر کافر کہا؟ کیا وہ یہ کہہ کر اسمبلیوں میں گئے تھے کہ اگر وہاں قرآن و سنّت کے خلاف کوئی فیصلہ ہوا تو جماعتِ اسلامی کے اراکین اسمبلی باقی اراکین کو اس سے خبردار کریں گے۔ اور کسی ایسے فیصلے سے خود الگ رہیں گے۔

پروفیسر صاحب نے آخری دو چیلنجوں کے تحت مسلمانوں کی غالب اکثریت پر دین کے حقیقی مفہوم کو بدل دینے کا الزام لگایا تھا۔ اور ہم نے اس ضمن میں اوپر مسیحیوں اور احمدیوں کے بارے میں خود مودودی صاحب کے متضاد چلن کا حوالہ دیا تھا۔ کیا وہ لوگ جو مسلمانوں کی غالب اکثریت پر مصلحت کوشی یا مفہوم طرازی کا الزام دھرتے ہیں خود اس اکثریت کو مصلحت ہی کی خاطر غلط راہوں پر ڈالنے کے مرتکب نہیں؟ دین کے وسیع و عریض نظام کے مفہوم کو بدلنا تو چھوڑ دیجئے جب ایک اتنے سیدھے سادے مسئلہ پر جہاں خود کفر و اسلام کی سرحدوں کی نشاندہی کرتے وقت وہ مصلحتاً مفہوم بدل دیتے ہیں۔ وہ باقی باتوں میں کس حد تک حق و انصاف کا ساتھ دیں گے۔ وہ تو اسی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ وسعت نخشی پر آئیں تو محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حلقہ بگوشی کو "محمدیت" کا طعنہ دے کر اسلام کا گویا نقیض ٹھہرا دیں اور کہہ دیں کہ خدا کی طرف سے آیا ہوا حقیقی دین ۔۔۔

محدیت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالےٰ کے احکامات کی فرمانبرداری ہے اور تنگ نظری پر آئیں تو اپنے جیسے کلمہ گوؤں کو محض اختلافِ تفسیر کے باعث دائرہ اسلام سے خارج کر دادیں۔ کیا یہ دقیس صاحب کی نظروں سے یہ حقیقتیں اوجھل ہیں۔ بھلا ایسے شخص دین کا صحیح مفہوم کیونکر متعین کریں گے۔ جب کہ ان کی مصلحت اندیشی میں مفاہیم کے بدل دینے کی گواہیاں خود ان کے چلن سے پھوٹی پڑتی ہیں۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا تفسیر تفہیم القرآن تیس سال کی محنت پر محیط ہے اور اس طویل محنت کا نتیجہ خود ایک ضخیم کتاب کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ ہم نے اس میں صرف ان چند مقامات کی طرف توجہ دلانا چاہی ہے جہاں ہمیں محسوس ہوا ہے کہ بات تشنہ رہ گئی ہے مقامات تو اور بھی بہت سے تھے لیکن چونکہ باوجود مختصر لکھنے کے بات طویل ہوتی چلی گئی اس لئے ہم نے اُن مقامات کو چھوڑ دیا ہے ہم نے جو ہماری سمجھ میں آیا عرض کر دیا ہے۔ ہم تفسیر تفہیم القرآن کے ان مخاطبوں میں سے ہیں۔ جن کے لئے یہ تفسیر لکھی گئی تھی۔ اس میں یقیناً اچھی باتیں بھی ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ تفسیر مذکور نے ایک بار پھر قدامت پرستی اور محدود ذہنی کی ترجمانی کی ہے۔ اگر یہ مستحسن عمل ہے تو یقیناً مودودی صاحب نے اس کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لیکن ہم اس قسم کے طریقِ تفسیر میں ایک مہیب خطرہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ اگر قدامت پرستی جو قومی عصبیت اور تقلید آباء ہی کا دوسرا نام ہے کا پائے چوبیں کبھی شکستہ ہو جائے تو پھر ایسے شخص کے ایمان اور اسلام کا خدا ہی حافظ ہے۔ یہ بند اسی وقت تک کام دیتا ہے جب تک اس کے نیچے آبائی عقیدے کا مضبوط پشتہ پہلے سے بندھا ہوا موجود ہو جس پر تشکک اور تفتیش کی موجیں اثر انداز نہ ہوئی ہوں۔ ایسا آدمی دراصل آبائی عقیدے اور روایت کا دفاع چاہتا ہے نا کہ خدا دوستی اور رضائے الٰہی۔ وہ بقول مودودی صاحب۔

"اگر کسی رسول کو مانتا بھی ہے تو کسی عصبیت یا تقلید آبائی کی بناء پر مانتا ہے۔ نفس پیغام رسالت کو نہیں مانتا وہ انبیاء کے گروہوں میں بے سوچے سمجھے گھس آیا ہے اور محض نبی یا بعض انبیاء کی شخصی گرویدگی میں مبتلا ہے۔ یا آباء و اجداد کی اندھی تقلید کو دین بنائے بیٹھا ہے۔ (تفہیم القرآن جلد سوم ص۴۹۴)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ